مونوگراف

مولانا حفیظ الرحمان
واصفؔ دہلوی

مرتب

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی

اردو اکادمی دہلی

مونو گراف

مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی

اردو اکادمی، دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر 173

Monograph

Maulana Hafizur Rahman Wasif Dehlavi

By

Dr. Mohd. Qasim Dehlavi

Pub. by

URDU ACADEMY, DELHI

Print
2011
Rs.50/-

ضابطے

سنِ اشاعت

۲۰۱۱ء

پچاس روپے
اصیلا آفسیٹ پریس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-176-3

ترتیب مشمولات

1 حرف آغاز 5

2 اپنی بات 7

3 مولانا واصفؔ دہلوی: حیات وفن ... تذکرہ مفتی اعظم ہندؒ 9

4 مولانا واصفؔ دہلوی 16

5 خاندانی پس منظر اور ولادت 17

6 تعلیم وتربیت 19

7 خوش نویسی وخطاطی 20

8 حلیہ واخلاق 22

9 مشاغل 24

10 شخصیت 27

11 زبان دانی 29

12 مولانا کے نظریات ارتقائے زبان 32

13 تاریخ کا مطالعہ 38

14 چند لطیف واقعات 40

15 شعر گوئی کی ابتداء 44

16 خصوصیات شعر 53

17	دوست احباب تلامذہ	60
18	مولانا واصفؔ دہلوی اور دہلی	61
19	قطعات تاریخ وفات	64
20	رحلت جامع العلوم	66
21	علمی و ادبی آثار	67
22	غالبؔ کا ایک شعر	78
23	انتخاب کلام	93
24	مآخذ و کتابیات	168

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہرِ بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے

بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی۔ دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے۔ ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ "ایوانِ اردو" اور "بچوں کا ماہنامہ امنگ" کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرِ نظر مونوگراف اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اردو اکادمی، دہلی کی سابقہ گورننگ کونسل نے وائس چیئرمین مرحوم پروفیسر قمر رئیس کی ایماء پر ادبِ عالیہ کے حوالے سے کلاسیکی ادباء و شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی منتخب تحریروں کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ نئی نسل ہمارے مشاہیر کے حیات اور کارناموں سے واقف ہو سکے۔ اس سلسلے کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ گورننگ کونسل نے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع کی ایماء پر مونوگراف کی اشاعت کے دوسرے سلسلے میں اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے اُن دہلوی ادیبوں کو شامل کیا ہے جنھوں نے اپنی نثری اور شعری تخلیقات کے ذریعہ اپنی علمیت کا لوہا منوایا۔ ان کی تحریریں آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں اور ایک ایسا ورثہ ہیں جنھیں آئندہ نسل کے لیے محفوظ کرنا ہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ میں اس کتاب کے مصنف کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بڑی محنت لگن اور دلجمعی کے ساتھ اس کام کو مکمل کیا۔ ان کی اس محنت نے اکادمی کے اشاعتی ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

انیس اعظمی
سکریٹری

اپنی بات

اربابِ اردو اکادمی، دہلی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھ کو مولانا واصفؔ دہلوی پر ایک مونو گراف کی تصنیف و تالیف کے لیے انتخاب کیا اور یہ خدمت میرے سپرد کی۔

مدرسہ امینیہ دہلی کے اہتمام کی ذمہ داریوں اور اپنی دینی و علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مولانا تالیفی و تصنیفی کاموں بھی مشغول رہے۔ ان کا اہم ترین تالیفی کام ”کفایت المفتی“ ہے جو نو جلدوں پر مشتمل فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ لسانیات اور ادب کے ماہر مولانا واصفؔ دہلوی بلند پایہ ادیب و شاعر بھی تھے۔ ان کی شخصیت و فن پر یہ پہلی کتاب ہے۔

اختصار کی پابندی کے سبب بیشتر نظمیں اس انتخاب میں شامل نہیں کی جا سکی ہیں۔ انشاء اللہ کسی اور موقع پر شائع کی جائیں گی۔

جن کتابوں اور اخبارات و جرائد سے اس مونو گراف کی تیاری میں مدد لی گئی ہے ان کی فہرست آخری صفحہ پر درج ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، ڈاکٹر شان الحق حقی، ڈاکٹر خلیق انجم، مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ، مولانا محمد سالم قاسمی، مفتی ظفیر الدینؒ، خواجہ حسن ثانی نظامی، پنڈت گلزار دہلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور عزیز وارثی کے مضامین کے اقتباسات اپنی ایک زیر ترتیب کتاب ”مولانا واصف دہلوی: شخصیت اور فن“ سے نقل کیے ہیں۔

محمد قاسم دہلوی
۴۱۷۰۔ اردو بازار، دہلوی۔ ۱۱۰۰۰۶

مولانا واصف دہلوی: حیات وفن

وہ جن کی لو سے ہزاروں چراغ جلتے تھے
چراغ بادِ فنا نے بجھائے ہیں کیا کیا
زمانہ ہلکا سا خاکہ نہ لے سکا جن کا
نقوش دستِ قضا نے مٹائے ہیں کیا کیا
(مولانا واصف دہلوی)

شاہجہان آباد دہلی ہمیشہ سے علم و ادب اور علوم وفنون کا مرکز رہی ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ المتوفی ۱۲۴۸ھ نے شاہجہاں آباد کی تعریف میں جو عربی قصیدہ تحریر فرمایا تھا اس کے ابتدائی دو شعر درج ذیل ہیں:

یامن بسائل عُلی دھلی ورفعتہا　　علی البلاد وما حازتہ من شرف
ان البلاد ا ماء وھی سید ة　　وانہا درة والکل کالصدف

(ترجمہ) کیا پوچھتے ہو دہلی کی عظمت کو اور دوسرے شہروں پر اس کی برتری اور شرف کو بیشک تمام شہر مانند لونڈی غلاموں کے ہیں اور دہلی سب کا آقا اور خداوند ہے۔ بیشک دہلی ایک گوہر یکتا ہے اور ہندوستان مانند سیپ کے ہے۔

ہر زمانے میں یہاں یکتائے روزگار ہستیوں نے جنم لیا ہے۔ ماضی قریب میں دہلی کے اُنہی جواہرات میں سے ایک درِ نایاب مفتی کفایت اللہ دہلوی نے دلّی کو رونق بخشی اور آسمان علم و دین اور بساط سیاست دونوں کو یکساں منور کیا۔ اگرچہ حضرت مفتی اعظم ہند، ابو حنیفہ ہندیؒ، فقیہ العصر، تاج الفقہاء والمحدثین مولانا محمد کفایت اللہؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں تاہم حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے مفتی صاحب کی وفات پر جو تعزیت نامہ

حضرت کے فرزند و جانشین مولانا واصفؔ دہلوی کو لکھا تھا وہ یہاں نقل کرتا ہوں۔ جس سے مفتی صاحب کی عالی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے:

''مولانا حفیظ الرحمن، دکھے دل کی تعزیت قبول کیجیے۔ مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی موت 'موت العالِم موت العالَم' کا صحیح مصداق ہے۔ دل کا سہارا ٹوٹ گیا۔ بتایئے اب ہماری جہالت، کم مائیگی ، بے بصیرتی کہاں رجوع کرے گی؟ فقہی، علمی، ملی الجھنوں کی سلجھی ہوئی تعبیر کہاں ملے گی؟ کس کی نکتہ رسی اور فطانت گہرائی میں ڈوب کر معاملہ کے پس منظر کی ہو بہو تصویر ہم کور بصروں کیلئے چند سادہ لفظوں میں اجاگر اور محسوس بنا کر سامنے کھڑی کر دے گی؟

اے اللہ رحمت کی بارش برسا اس نیک نہاد ہستی پر جو سادہ ، بے تصنع ، فراخ حوصلہ، غیور، بے طمع، دین و ملت کا مخلص خادم، کوہ وقار، علم کا منار تقوی و ورع کا پیکر، اسلامی اخلاق کا نمونہ و مجسمہ، مفتی، ادیب اور ایوان جمعیۃ علماء ہند کے بنیان مرصوص کی پہلی آئینی اینٹ تھی۔''

مفتی صاحب کے تذکرہ کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ یہاں مختصر اشارے اس لئے ضروری ہیں کہ معلوم ہو سکے کہ مولانا واصفؔ دہلوی کی شخصیت سازی میں کیا عوامل کارفرما رہے اور انھوں نے کس منبع علم و ادب سے کسب فیض کیا۔

ملا واحدی نے مفتی صاحب اور ان کے معاصرین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ ایسے حضرات تھے جن کے ذکر سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔'' مفتی صاحب کی شخصیت اور سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ملا واحدی نے دلچسپ انداز میں لکھا ہے:

''مفتی صاحب ہمیشہ میرے پڑوسی رہے... میں نے انھیں مسلسل دیکھا اور قریب سے دیکھا۔ علم کی جگہ علم، فراست کی جگہ فراست اور مومنانہ فراست توکل، قناعت، سادگی، وضعداری، پابندیٔ سنت۔ کونسی خوبی ہے جو مفتی کفایت اللہ میں نہ تھی۔ کم بولتے تھے مگر بولنے میں وزن ہوتا تھا۔ خواص پر ان کا اثر تھا۔ عوام پر ان کا اثر تھا۔ سیاسیین پر ان کا اثر تھا۔ حکیم اجمل خاں

> اپنی مجلس اور اپنے مطب میں کسی کی تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے تھے لیکن مفتی صاحب کے لئے کھڑا ہوتے ہوئے میں نے دیکھا ہے"۔

(میرے زمانے کی دلّی ص ۳۱۴)

تمام سیاسی رہنما خواہ ہندو ہوں یا مسلمان مفتی صاحب کی تہِ دل سے عزت کرتے تھے۔ ملّا واحدی نے ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "ایک دفعہ پنڈت مدن موہن مالوی سے ہندو مسلم سوال پر مفتی صاحب سرگرم گفتگو تھے۔ یہ جب کا واقعہ ہے کہ جب دلّی میں کانگریس کا اجلاس ہوا ہے اور مالوی جی نے اس کی صدارت کی ہے۔ گفتگو میں کوئی نوخیز ہندو لیڈر مفتی صاحب سے الجھنے لگا۔ مالوی جی نے اسے ڈانٹ کر کہا تم جانتے نہیں کس سے گفتگو کر رہے ہو"۔ (ایضاً ص ۳۱۴)

مفتی صاحب جنگ آزادی کے مجاہد تھے۔ ان کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بیسویں صدی کے عظیم سیاسی رہنما اور مجاہد آزادی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاؔد نے فرمایا:

> "۱۹۲۰ء میں جب جیل سے رہا ہوا تو اُن (مفتی صاحب) سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت سے برابر ان کی زندگی کو پرکھتا رہا۔ ان کی ہمت، جرأت اور استقامت کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ وہ طوفانی دور تھا کہ بڑی بڑی شخصیتیں اس دور میں بہکیں لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے عزم، ہمت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا اور ان طوفانوں کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی۔ انھوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے اس راستے سے قدم نہیں اٹھایا آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی روح ہم سے قریب ہے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہندوستان کی تاریخ میں ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے

ہوئے کہا تھا:

> ''مفتی صاحب ایک سیدھے، قابل، صاف اور ستھرے ذہن کی مثال تھے۔ ایسے آدمی کم ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی آدمی کی قدر کی جاتی ہے۔ انکے گزرنے کا افسوس ہے... سیاسی میدان میں بہت سے لوگ آئے لیکن ایسی سادگی کی مثال نہیں ملتی۔ لوگ عہدوں کے بھوکے ہوتے ہیں، مفتی صاحب اگر پسند فرماتے تو وہ ہر عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ افسوس وہ گزر گئے لیکن مجھے امید ہے کہ انکو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا''۔

یہ دونوں اقتباس ان تقریروں کے ہیں جو کانگریس کمیٹی کے تعزیتی اجلاس منعقدہ ۴؍جنوری ۱۹۵۳ء بمقام اردو پارک دہلی وزیر اعظم پنڈت نہرو اور وزیر تعلیم مولانا آزاد نے کی تھیں۔

مفتی صاحب کا ایک بہت بڑا کارنامہ ''جمعیۃ علمائے ہند'' کی تاسیس ہے۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں مفتی صاحب کی تحریک پر جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ جمعیۃ علماء کی تاسیس کے وقت مفتی صاحب کو نائب صدر اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو صدر منتخب کیا گیا۔ جمعیۃ کی پہلی کانفرنس میں شیخ الہند کا خطبہ صدارت مفتی صاحب نے ہی پڑھا تھا کہ سخت علالت کے سبب حضرت شیخ الہند اجلاس میں شرکت نہیں فرما سکتے تھے۔ شیخ الہند کی وفات کے بعد مفتی صاحب صدر منتخب ہوئے اور بیس سال یعنی قیام جمعیۃ سے ۱۹۳۹ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس اہم ترین تنظیم کے صدر کی حیثیت سے مفتی صاحب نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔

مفتی صاحب کی علمی فقہی صلاحیتوں کے ساتھ ان کی سیاسی بصیرت بھی استاد محترم حضرت شیخ الہندؒ نے ابتداء میں ہی محسوس کر لی تھی اور ارکان جمعیۃ علماء کو وصیت کی تھی کہ دو آدمیوں کو ہرگز نہ چھوڑنا ایک مولانا کفایت اللہ (صدر جمعیۃ علماء ہند) اور دوسرے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (مہتمم دار العلوم دیوبند)۔ حضرت شیخ الہند جب سیاسی معاملات میں کسی لیڈر سے گفتگو کرتے تو فرماتے تھے کہ ہمارے کفایت کو بلاؤ۔ ایک طرف حضرت شیخ کے وہ رفقاء اور تلامذہ تھے جو ہر وقت کے حاضر باش اور ساتھ رہنے والے اور ہر حالت میں

شریک تھے، مالٹا میں اسیری کی سختیاں جنھوں نے آپ کی ہم نشینی میں جھیلی تھیں اور دوسری طرف حضرت شیخ کا ہر اہم معاملے میں مولوی کفایت کو یاد کرنا۔ آخر ایک روز ایک اور خاص شاگرد نے عرض کیا کہ حضرت ہم بھی تو آپ کے ہمراز و دمساز خدام ہیں اور سیاسی معاملات سے بھی واقف ہیں۔ فرمایا ہاں بیشک تم لوگ سیاست داں ہو لیکن مولوی کفایت کا دماغ سیاست ساز ہے۔ (مفتیٔ اعظم ہند از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری)

پہلی گرفتاری: — تحریک سول نافرمانی میں آپ انگریز حکومت کے خلاف تقریریں کرنے کے جرم میں پہلی مرتبہ ۱۱/ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو اپنے دولت خانے کوچہ چیلان سے رات کے چار بجے گرفتار کرلیے گئے۔ حکومت برطانیہ آپ کی عظمت سے واقف تھی۔ پہلے سے تمام ریزرو پولیس کو دہلی بلالیا گیا۔ مشین گنوں کا انتظام کرلیا گیا۔ شہر کے گلی کوچوں کی سخت ناکہ بندی کردی گئی۔ قصاب پورہ، پہاڑ گنج وغیرہ کی طرف خاص انتظامات تھے۔ رات کے تین بجے گلی کوچوں میں آمد و رفت بالکل بند کردی گئی حتیٰ کہ نماز فجر کیلئے جانے والوں کو بھی گھروں سے نکلنے نہ دیا۔ چار بجے کوتوال شہر، مجسٹریٹ وغیرہ آئے اور مفتی صاحب ان کے ساتھ تشریف لے گئے۔ چھ ماہ قید اے کلاس کا حکم سنایا گیا اور گجرات جیل بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری، خان عبدالغفار خاں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا احمد سعید، آصف علی بیرسٹر وغیرہ جیل میں ساتھ تھے۔

دوسری گرفتاری: — ۱۱/ مارچ ۱۹۳۲ء کو جلوس لے کر آزاد پارک ٹاؤن ہال پہنچے۔ تقریر شروع ہونے سے پہلے ہی لاٹھی چارج کرکے آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس بار ملتان سینٹرل جیل میں رکھا گیا۔

ان سب مصروفیات کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب اپنے فرائض منصبی درس و تدریس اور افتاء میں مکمل توجہ اور انہماک کے ساتھ مشغول رہے۔ فتویٰ خود اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور سائل کو کبھی انتظار کی زحمت نہیں دیتے تھے۔ جس طرح مفتی صاحب کی شخصیت تقویٰ و عربی شرافت میں منفرد تھی اسی طرح آپ کے فتاویٰ بھی انفرادی شان رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب حامل حلم صدیقی تھے۔ عدل فاروقی، ثنائے عثمانی اور علم علوی کی جھلک ان کی شخصیت و عمل سے ظاہر ہوتی تھی۔

حضرت مفتی صاحب مدرسہ امینیہ دہلی کے مہتمم، صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے خاص تلامذہ میں عزیز و معتمد ترین شاگرد تھے۔ تعلیم و تدریس اور سیاست دونوں میں شیخ الہند کے جانشین تھے۔ عربی فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ادیب تھے۔ حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ علماء کے محرک اور بانی تھے۔ بیس سال مسلسل اس کے صدر رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس اور خلافت کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ بقول جناب گلزار دہلوی کانگریس کی تمام تجاویز پہلے اردو میں مفتی صاحب تحریر فرماتے تھے پھر ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے تاعمر صدر رہے (یہ ٹوٹے ہوئے تارے ص ۱۲۱۔ از مولانا شاہ محمد عثمانی)۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن تھے (قومی آواز ہفت روزہ دہلی ۲۴/مارچ ۱۹۸۵ء) مدرسہ اسلامیہ فتحپوری دہلی کے بھی مہتمم تھے۔ مفتی صاحب نے ہی سب سے پہلے شرعی عدالتوں کا نظریہ پیش کیا۔ غرضیکہ آپ نے ہر پلیٹ فارم سے دین وملت کی خدمت اور رہنمائی فرمائی۔ آپ متحدہ قومیت کے زبردست حامی اور علمبردار تھے۔

۳۱/دسمبر ۱۹۵۲ء کی شب ساڑھے دس بجے زہد وتقویٰ، رشد وہدایت، علم وحلم، فقہ وحدیث، شریعت وطریقت، افتاء وسیاست کا یہ آفتابِ عالم تاب غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کہ مخلوق فنا کے لئے ہی عدم سے وجود میں لائی گئی ہے۔ ملک وملت کے اس ناقابل تلافی نقصان پر اہل دل اور اہل قلم نے خون جگر سے صفحۂ قرطاس پر گل بوٹے بنائے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے مولانا واصف دہلوی کو تعزیتی مکتوب میں لکھا:

> ”آج دنیائے علم وتقدس میں وہ حادثہ پیش آگیا جو ناقابل تلافی ہے۔ حضرت اقدس آپ ہی کے باپ نہیں تھے، امت مرحومہ کے باپ تھے علم دین کی پناہ تھے تقدس کی روح تھے۔“

حضرت مولانا قاری طیبؒ صاحب اپنے خاص فلسفیانہ انداز میں فرماتے ہیں:

> ”افسوس مرحوم ومغفور ہونے پر نہیں کہ یہ تو زندگی کا انتہائی مطلوب ومتمنا ہے۔ افسوس ان کے وصال پر نہیں کہ وصال بحق تو حصول مقصود ہے۔ افسوس فراق

پر ہے کہ ایک روشنی ہم میں تھی نہ رہی۔ علم و عمل کی کتنی خصوصیات ہم میں جلوہ پیرا تھیں اور چھن گئیں۔"

ناز انصاری مرحوم نے "نئی دنیا" کے اداریے میں لکھا تھا:

"دین و مذہب کا ایک مجسم پیغام تھا جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ حق و معرفت کی آواز تھی جواب کبھی نہ سنی جا سکے گی۔ بساط سیاست کا ایک رہنما تھا جو اٹھ گیا۔ اسلام کا ایک علمبردار تھا جو ہم سے جدا ہو گیا ہندوستان کی تاریخ آزادی کا ایک باب تھا جو ختم ہو گیا۔ قصر حریت کا ایک معمار تھا جس نے تکمیل قصر میں حصہ لیا، خشت آخر اپنے ہاتھوں رکھی لیکن رخصت اس حال میں ہوا کہ ساتھی قصر میں تھے اور وہ اپنے پرانے جھونپڑے میں۔"

تقسیم ہند کے بعد کے فرقہ وارانہ ماحول نے آپ کو بہت رنج پہنچایا تھا۔ اپنے چھوٹے بیٹے کو (جو کراچی چلے گئے تھے) ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"گاڑیاں چلنی شروع ہو گئی تھیں مگر کل سے پھر آٹھ نو دن کیلئے بند ہو گئیں۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ یہاں بھی بے حد پریشانی ہے اپنا محلہ پونا خالی ہو گیا ہے پاؤ رہ گیا ہے وہ بھی خالی ہونے کو ہے۔"

(پیارے بیٹے پیاری بیٹی ص ۸۸)

بیسویں صدی ایسا عظیم عالم دین مفتی بے نظیر، سالار کاروانِ شریعت اور رہنمائے بساط سیاست دوسرا نہ پیدا کر سکی اور نہ آیندہ آثار ہیں کہ قحط الرجال کے اس دور میں کسی خلاء کا پر ہو جانا کبھی روایت نہیں رہا۔

☆☆☆

مولانا واصفؔ دہلوی

۱۳ر مارچ ۱۹۸۷ء بروز جمعہ شام پونے پانچ بجے کی وہ گھڑی اِس بدنصیب کے دل ودماغ سے محو نہیں ہوتی، وہ دلسوز منظر اس کور قسمت کی آنکھوں سے کسی لمحہ اوجھل نہیں ہوتا کہ جب علم وحکمت کا وہ آفتابِ شام جس سے علم وادب کے بے شمار متلاشی نور حاصل کررہے تھے غروب ہوا، عالم اسلام سے ایک یگانۂ روزگار باپ کا فخر روزگار بیٹا پردہ فرما گیا، ہندوستان اپنے ایک جلیل القدر فرزند سے محروم ہوا، دہلی سے اس کا ایک مایۂ ناز سپوت چھن گیا، زبان دہلی کو یادگار سائلؔ اور محافظ زبانِ داغؔ داغِ مفارقت دے کر ماتم کناں کر گیا اور محفل داغؔ کے ایک انمول چراغ کی لو تھرتھرا کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ یعنی جامع العلوم حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی ہزاروں عقیدت مندوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہیٔ مُلک بقا ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خدا نے آپ کو ایک اہم دینی وعلمی خدمت انجام دینے کے لئے عالم فانی میں بھیجا اور آپ نے اس عظیم الشان خدمت کو کمال ذمہ داری، تندہی اور حسن عمل کے ساتھ انجام دیا اور واپس اپنے رب کے حضور پہونچ گئے۔ نَوَّرَ اللہُ مَرْقَدَہٗ۔ اور وہ خدمت ہے مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ کے فتاویٰ کی جمع وتبویب اور اشاعت۔

یہ چند سطریں جو میں تحریر کررہا ہوں محض مجموعہ ہیں چند پریشان خیالوں اور ناکافی معلومات کا جو میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد حضرت والد ماجد مولانا واصفؔ دہلوی علیہ الرحمۃ سے ان کی زندگی کے آخری دس بارہ برس میں سنیں اور ذہن میں محفوظ کرلیں۔ اور اِس وقت اپنی کم علمی، بے بضاعتی، تہی دامنی اور بدقسمتی کا احساس پوری شدت سے ہورہا ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو ایک قالبِ انسانی میں بہت بڑا فعال ادارہ اور مخزن تاریخ واسرارِ ملکی وملی

تھی، اس کے بارے میں تفصیل سے میں بھرپور معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہوں۔ تاہم ایک فرشتہ صفت، نرم دل، عالی ہمت، پاک نفس، عالم باعمل، مجسمہ عجز وانکسار، پیکرِ استغناء وخودداری، علامہ یگانہ، ہمہ صفت موصوف، شریف ونجیب شخصیت کی صاف ستھری درویشانہ زندگی کے کچھ واقعات قلم بند کردینے چاہتا ہوں۔ یعنی ان نقوش کا ہلکا سا خاکہ صفحہ قرطاس پر ابھاردوں جو اس ہستی نے صفحہ ہستی پر بنائے کہ آنے والی نسلوں کے لئے مثالی کردار سازی میں معاون ثابت ہوں۔

حضرت والد ماجد کی زندگی میں میں نے بارہا کوشش کی کہ وہ اپنی زندگی، مشاغل، اہم واقعات وغیرہ املا کرادیں مگر ہمیشہ یہ جواب ملا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلو یہ باتیں فرصت کی ہیں لکھوادیں گے۔ اور میں تعلیم سے اس حال میں فارغ ہوا کہ ہر طرف سے مختلف مسائل ومصائب کی تمازت تھی اور میرے سر پر وہ مشفق ومحترم سایہ نہیں تھا جو اولاد کے لئے دنیا میں نعمت بے بدل اور سرمایۂ گرانمایہ ہوتا ہے کہ جب اولاد ہر طرف سے مایوس ہو جاتی ہے تو باپ کی ہی آغوش رحمت میں پناہ لیتی ہے اور اسی دامن شفقت کے سائے میں آکر سارے غم بھول جاتی ہے۔ اس سائے کے اٹھ جانے کے بعد مشکل اگرچہ رائی برابر ہو مصائب کا ایک کوہ گرانبار معلوم ہوتی ہے۔ یہ جوابا جان نے کہا کہ پہلے تعلیم مکمل کرلو یہ تو تھی ایک ظاہری وجہ اور ان کا میرے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونا لیکن اپنی صوفی منش زندگی کے درویشانہ فلسفہ کو ایک رباعی میں یوں بیان کیا ہے:

محفل میں جو تو جائے تو مخدوم نہ ہو
اور آئے اگر اٹھ کے تو معلوم نہ ہو
یوں جی کہ پس مرگ نہ پوچھیں تجھ کو
مر کر بشریت تری معدوم نہ ہو (زرگل)

خاندانی پس منظر اور ولادت :

مولانا واصف دہلوی کے والد کا نام مفتی کفایت اللہ ابن شیخ عنایت اللہ ابن شیخ فیض اللہ ابن شیخ خیر اللہ ابن شیخ عباد اللہ ہے۔ یہ سلسلہ نسب شیخ جمال یمنی سے جا کر ملتا

ہے۔ آپ کا اجدادی وطن جزیرۃ العرب کا جنوبی ساحلی خطہ یمن ہے۔ یہ لوگ موتی جواہرات کے تاجر تھے۔ بحرین سے جواہرات خرید کر ہندوستان لنکا وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں لاکر فروخت کرتے تھے۔ (مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی ص ۳۰)

۲۸ر محرم ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۰ر فروری ۱۹۱۰ء کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے گلشن حکمت میں ایک غنچۂ علم و فضل مسکرایا اور افق شاہجہان آباد سے ایک اور آفتاب علم و ادب طلوع ہوا جس کی روشنی سے دنیائے علم و دین کو منور ہونا تھا۔ یعنی فقیہ الامت کے ہاں فرزند ارجمند کی ولادت باسعادت ہوئی۔ عالم اسلام اور دنیائے ادب نے جس کو مولانا مفتی حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی کے نام سے جانا۔

آپ کا اسم مبارک حفیظ الرحمان تاریخی نام ہے اس کے اعداد ۱۳۲۸ ہوتے ہیں اور یہی ہجری سال سنہ ولادت ہے بایں وجہ رحمان کو الف کے ساتھ تحریر فرماتے تھے۔

حضرت مولانا کی وفات پر مشہور صحافی جمیل مہدی مرحوم نے ''برہان'' دہلی (اپریل ۱۹۸۷ئ) میں ایک طویل اداریہ لکھا تھا۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''وہ اُس خانوادۂ علم و شریعت کے چشم و چراغ تھے جس نے ۱۸۵۷ء میں اجڑنے والی دہلی کو از سر نو سجانے اور بہاروں سے آراستہ کرنے میں حصہ لیا تھا اور ایک پورے تمدن کی تباہی کے بعد اس کے ملبے سے نئی اور دلآویز عمارت تعمیر کرنے کی ہمت دکھائی تھی۔''

مولانا کی قلندرانہ کسر نفسی کی مثال ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

مانا کہ بڑے باپ کا تو ہے فرزند   جس باپ کی کھاتا ہے زمانہ سوگند
نسبت ہے بہت بڑی مگر تو کیا ہے   ''بدنام کنندۂ نکو نامے چند''

مولانا کے آثار علمی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے مفتی صاحب کے علمی و ادبی آثار کی جمع آوری و ترتیب اور مدرسہ کی خدمت کیلئے خود کو وقف کر کے اس بڑی نسبت اور جانشینی کا حق ادا کیا۔

تعلیم وتربیت:

تین چار برس کے ہوئے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے ساتھ مدرسہ لے جانا شروع کردیا۔ دن بھر وہیں رہتے۔ کبھی کبھی جب ملازم کھانا لینے گھر آتا تو اس کے ساتھ دوپہر کو گھر آجاتے لیکن اکثر اپنے ''اباجی'' کے ساتھ ہی واپس آتے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحب گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز کلاں محل میں سکونت پذیر تھے۔ مدرسہ امینیہ میں ہی مفتی صاحب کی نگرانی میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ یہیں عربی فارسی نصاب کی متوسطات سے انتہا تک تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ میں حضرت مفتی اعظمؒ، حضرت مولانا خدا بخشؒ، حضرت مولانا محمد حسن دوحدیؒ، حضرت مولانا عبدالغفور عارفؔ دہلوی وغیرہ سے عربی فارسی ادب، علم عروض، علم قرآن وحدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی۔ درس نظامی کے نصاب کے علاوہ عربی ادب کی کتابیں بھی مفتی صاحب سے پڑھیں۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری تحریر کرتے ہیں:

> ''(مولانا واصفؔ دہلوی) مدرسہ امینیہ سے فارغ التحصیل تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ حضرت مفتی صاحب کے سعید وصالح بیٹے ہیں بلکہ لائق اور قابل فخر شاگرد بھی ہیں۔'' (مفتی اعظم ہند ص ۱۰۵ و ۱۱۱)

مولانا قاری شریف احمد دہلوی (خطیب جامع مسجد ٹی اسٹیشن کراچی) تعزیتی خط میں مولانا سے اپنے مراسم قدیم کو یاد کرتے ہوئے راقم الحروف کو لکھتے ہیں:

> ''میں جب مدرسہ امینیہ میں ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا تو آپ کے والد صاحب کی مشکوۃ شریف تھی۔''

علم عروض کی کتاب ''محیط الدائرہ'' پڑھنے کے لئے جب والد محترم سے خواہش ظاہر کی تو مفتی صاحب نے اپنی دینی، علمی، ملی اور سیاسی مصروفیات کے پیش نظر فرمایا کہ خدا بخش سے کہو وہ پڑھا دیں۔ واصفؔ صاحب نے مولانا خدا بخش سے عرض کیا تو مولانا نے فرمایا ''بیٹا یہ کتاب تو میں نے پڑھی بھی نہیں، نہ میں یہ فن جانتا ہوں''۔ واصفؔ صاحب نے عرض کیا ''حضرت میں تو آپ ہی سے پڑھوں گا، اباجی نے آپ کا نام ہی تجویز فرمایا ہے۔''

فرمایا ''اچھا اگر مفتی صاحب کا حکم ہے تو کتاب دو چار دن کے لئے مجھے دے دو مطالعہ کر کے پڑھا دوں گا۔'' چنانچہ عصر کے بعد کا وقت طے ہوا۔ اور مدرسہ کے طے شدہ نصاب کے علاوہ طالب علمی کے زمانے میں ہی آپ نے یہ فن سیکھا اور یہ کتاب پڑھی۔ اور مولانا خدا بخش نے اس محنت و مہارت سے پڑھائی کہ گویا وہ اسی علم کے استاد ہوں۔ واصفؔ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے عربی ادب کا کورس مولوی عالم بھی پاس کیا۔

خوشنویسی و خطاطی:

مولانا کی تحریر نہایت خوشخط، پاکیزہ، خوبصورت اور شستہ و شائستہ تھی۔ آپ کے قلم مبارک (پنسل، بال پین یا فاؤنٹین پین) سے لکھی ہوئی تحریر کیا ہوتی تھی گویا حسین و جمیل مینا کاری ہوتی تھی۔ موتی جڑے ہوئے۔ فاؤنٹین پین پنسل وغیرہ سے رقم شدہ تحریریں بھی نوک پلک، جوڑ پیوند، چھوٹے بڑے شوشوں کے تناسب اور محل استعمال کے لحاظ سے فن خطاطی کے قواعد کا مظہر ہوتی تھیں، آپ نے نستعلیق کی باقاعدہ مشق بھی کی تھی۔ اُس زمانے میں شرفاء میں بچوں کی تعلیم میں فن خطاطی اور شعر و ادب کی تعلیم بھی شامل ہوتی تھی۔ منشی حامد حسین فرید آبادی دہلی میں بہت مشہور استاد تھے۔ عقب کلاں محل میں رہتے تھے، ان کے شاگرد ہوئے۔ یہ شاگردی ۳۳۔ ۱۹۳۲ء یا اس کے کچھ بعد کا واقعہ ہے کہ منشی نیاز الدین صاحب مرحوم مالک کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی بتاتے تھے کہ میں منشی صاحب موصوف کا شاگرد ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا اور اس سے پہلے ہی مولانا واصفؔ صاحب فارغ ہو چکے تھے۔

مولانا نے نستعلیق میں اعلیٰ درجہ کی مہارت اور استادانہ شان پیدا کی۔ اس کے بعد استاد سے خط نسخ کی مشق کی خواہش ظاہر کی۔ استاد اگرچہ نسخ میں لکھتے تھے لیکن اصلاح کے لئے اپنے استاد منشی عبدالغنی ابن منشی ممتاز علی کے پاس بھیجا۔ منشی عبدالغنی اپنے والد کے شاگرد بھی تھے۔ اور منشی ممتاز علی فن خوشنویسی میں اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔ چنانچہ مولانا اس سلسلہ تلمذ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی سراج الدین ظفرؔ بہادر شاہ (بَرَّدَ اللہ مضجعَہٗ) سے خوش

نویسی میں انتساب حاصل ہے۔ ۶حقر نے نسخ میں استاد عبدالغنی دہلوی ابن منشی ممتاز علی سے اصلاح لی ہے اور منشی ممتاز علی خوش نویسی میں اعلیٰ حضرت ظفرؔ بہادر شاہ کے شاگرد تھے۔" (زرگل۔ص ۱۶۹)

مولانا جب اصلاح کی غرض سے استاد عبدالغنی کے پاس پہنچے جو اپنے مطبع مصطفائی واقع کھڑکی تفضّل حسین کے باہر بیٹھا کرتے تھے وہیں شاگردوں کو اصلاح بھی دیتے تھے اور اپنا کتابت کا کام بھی کرتے تھے۔ منشی صاحب کی عادت تھی کہ غصہ میں شاگردوں کو بے حساب گالیاں دیا کرتے تھے اور ان کو غصہ بہت جلد آجاتا تھا۔

جب مفتی اعظمؒ کا فرزند اُن کے پاس بغرض تلمذ حاضر ہوا تو پہلے تو بہت انکار کیا اور انکار اسلئے کہ اپنی گالیوں کی عادت پر وہ قابو نہیں رکھ سکتے تھے اور مفتی صاحب کی تقدیس کے پیش نظر ان کے فرزند کے سامنے زبان سے گالی نکلنا منشی صاحب کے لئے باعث شرم و ندامت ہوتا۔ لیکن اصرار کرنے پر اصلاح دینے کے لئے راضی ہو گئے۔ اور اس وقت موجود اپنے شاگردوں کو دو چار مغلظات سنانے کے بعد کہا:

> "دیکھو بے! اب مجھے نہ چھیڑنا۔ یہ مفتی صاحب کا بیٹا ہے اسکے سامنے میرے مونھ سے گالی نہ نکل جائے۔"

ایک دو ہفتہ سے زیادہ وہاں واصفؔ صاحب نہیں گئے۔ اور اسی عرصہ میں مفتی صاحب کے ہونہار باصلاحیت فرزند نے نسخ میں کمال پیدا کرلیا۔

آپ کی خطاطی کے نمونے آپ کے احباب، اقربا اور عقیدت مندوں کے پاس محفوظ ہوں گے۔ مولانا اپنی مدرسے کی اور تصنیف و تالیف کی مصروفیتوں سے وقت نکال کر نسخ و نستعلیق میں طغرے تحریر فرماتے۔ یہ آپ کا تفریحی مشغلہ تھا۔ اور طغرے اکثر لکھتے اور احباب کو تحفۃً عطا فرماتے تھے۔ اور یہ مشغلہ آخری دم تک جاری رہا۔ ابتدائی زمانے کے تحریر کردہ طغرے جو موجود ہیں وہ ۱۳۵۰ھ کے ہیں۔ اور وہ حضرت نے فریم کراکے اپنے کمرے میں آویزاں کر رکھے ہیں جو خط نسخ کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور اب اس کمرے کی بے رونقی پر حیران ہیں۔

حکیم عبدالحمید صاحب کو ایک طغرہ لکھ کر ہدیہ کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

اِنَّہٗ حمیدٌ مجید

وفات سے ایک دن قبل اپنے اس ناکارہ بیٹے کیلئے ایک مصرع نستعلیق میں رقم فرمایا تھا: ''معطی ہے خدا اور ہے محمدؐ قاسم'' جو ایک حدیث شریف انما انا قاسمٌ واللہ یعطی کا ترجمہ ہے۔

اور اسی دن سب سے چھوٹے فرزند محمد سالم کے لئے بھی ایک مصرع تحریر فرمایا تھا: ''رہو آفات سے باحسبِ محمدؐ سالم''۔ اور یہ ایک فاضل باپ کے اپنے بچوں کے لئے آخری دعائی کلمات ہیں۔

یہ بھی آپ کی عادت تھی کہ اپنی تصانیف کے سرورق ہمیشہ اپنے ہی قلمِ حسین رقم سے تحریر فرماتے تھے چنانچہ سوائے ''درس الاسلام'' کے سب کتابوں کے ٹائٹل فنِ خطاطی میں آپ کے یدطولیٰ کا مرقعہ ہیں۔

جمیل مہدی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

> ''جگر مرادآبادی کے بعد مولانا واصفؔ ہی اردو کے ایسے شاعر تھے جو خوشنویسی میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے اور جن کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے خطاط اور خوشنویس ہوتے۔ انھوں نے خوشنویسی نہ صرف اپنے والد سے ورثہ میں پائی تھی بلکہ مشق اور محنت کے ذریعہ اس میں استادانہ مہارت بھی حاصل کی تھی۔''

''برہان'' دہلی (اپریل ۱۹۸۷ئ)

حلیہ واخلاق:

ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

''(مولانا واصفؔ صاحب) خاموش مزاج، مرنجاں مرنج اور علم دوست انسان تھے۔ پتلے دبلے، ہلکے پھلکے، سادہ لباس، سادہ طبیعت، روشن آنکھیں، مسکراتا ہوا چہرہ اور اس پر ان کی منکسر المزاجی ان کی شخصیت کو دلکش اور ایک حد تک پر اسرار بنادیتی تھی۔ اگرچہ وہ بہت کھلی طبیعت کے انسان تھے اور اپنی شخصیت

> پر کوئی خوش نما نقاب ڈالنے کی کوشش انھوں نے کبھی نہیں کی، جس سے ملتے اس طرح ملتے کہ جیسے وہ اس کے اپنے ہوں، انھوں نے کبھی کسی سے کوئی فاصلۂ ذہنی نہیں رکھا، لیکن سچ یہ ہے کہ وہ عام لوگوں سے اور عام روشوں سے بہت دور کھڑے ہوئے انسان تھے۔“

جامہ زیبی کا پاکیزہ ونفیس ذوق رکھتے تھے۔ قمیص پاجامہ پہنتے تھے۔ قمیص میں کرتے جیسا کالر ہوتا تھا اور چاندی کے بٹن۔ سفید رنگ کا پاجامہ اور باریک چیک یا سادی ہلکے رنگ کی قمیص، ہر موسم میں شیروانی زیب تن فرماتے تھے، گرمی میں سوتی یا ٹیری کاٹ کی اور سردی میں گرم اونی اکثر کالے رنگ کی۔ سردی میں قمیص پاجامہ بھی گرم کپڑے کا ہوتا تھا۔ ایک رومال رکھتے تھے سردی میں جس کو گردن پر لپیٹ لیتے یا عمامہ کی طرح سر پر باندھتے تھے۔ سنجیدہ چہرے پر علمی وقار ومتانت چمکتی، مسنون ڈاڑھی، سانولا رنگ، ہلکے فریم کا نفیس چشمہ، سر پر گھر کی سلی ہوئی مناسب باڑھ والی کپڑے کی ٹوپی اور سردی میں کھال کی ٹوپی پہنتے تھے۔ سراپا سے شریفانہ نفاست وپاکیزگی ہویدا ہوتی تھی۔ کھانے پینے کے معاملہ میں بہت خوش ذوق تھے لیکن خوش خوراک نہیں تھے، صرف اتنا کھاتے کہ ارتباط جسم وجاں قائم رہ سکے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے الفاظ میں:

> ”ان کی سادہ زندگی ان کا ادبی سفر ان کا رہن سہن ہر لحاظ سے قابل رشک تھا۔ بلکہ قابل ستائش بھی۔ اب بھی جب وہ یاد آتے ہیں تو دلّی کی وہ پرانی محفلیں نشستیں مشاعرے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔۔۔۔ کاش! ہمارے آج کل کے شاعر ان کی شاعری اور زندگی سے استفادہ حاصل کریں۔“

گلزارؔ صاحب فرماتے ہیں:

> ”اپنی ذات سے ہمہ صفت موصوف، باخلاق، مرنجاں مرنج، گوشہ نشین، کم آمیز، کم گو اور شریف الطبع انسان تھے۔“

مولانا نے بڑی منظم اور صاف ستھری زندگی گزاری۔ ان کے کمرے میں کتابیں اور دیگر پڑھنے لکھنے کا سامان رکھنے کا انداز اور سلیقہ وقرینہ قابل دید تھا۔

مشاغل:

تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دہلی کے محکمہ تعلیم میں عربی زبان وادب کے استاد مقرر ہوئے۔ لیکن یہ ملازمت زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکی کیونکہ ۱۹۳۶ء میں مفتی صاحب نے کتب خانہ رحیمیہ کا انتظام مولانا واصفؔ صاحب کے سپرد کردیا اور اس بارے میں مولانا فرماتے تھے کہ اس تبدیلی سے یہ خوشی ہوئی تھی کہ اب طرح طرح کے علوم وفنون کی مختلف کتابیں ہاتھ کے نیچے رہیں گی اور پڑھنے لکھنے اور تصنیف وتالیف کے شوق کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا خوب موقع ملے گا لیکن ہوا یہ کہ کاروباری مصروفیات میں الجھنا پڑ گیا۔ مگر مشیت ایزدی کو منظور کچھ اور تھا۔ خدا نے آپ کو اپنے دین کی خدمت کے لئے دنیا میں بھیجا تھا۔ مفتی اعظمؒ سے تربیت کروائی تھی۔ ذہن رسا عطا فرمایا تھا۔

مدرسہ امینیہ کا اہتمام:

حضرت مفتی اعظمؒ کے وصال کے بعد شیخ الاسلام مولانا مدنی، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن وغیرہ بزرگوں کی جوہر شناس نظر انتخاب مولانا واصفؔ دہلوی پر پڑی۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں مولانا احمد سعید کو مدرسہ کا مہتمم اور مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی کو نائب مہتمم بنایا گیا۔ اس تقرر کی اطلاع دینے کے لئے مولانا احمد سعیدؒ نے واصفؔ صاحب کو ایک خط بھیجا جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> برادرم مولوی حفیظ الرحمن صاحب زید مجدہم مدرسہ امینیہ عربیہ دہلی کی منتظمہ کمیٹی منعقدہ ۲۶؍ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ نے اتفاق رائے سے مدرسہ امینیہ کے نائب اہتمام کے عہدہ پر آپ کے تقرر کو منظوری دی ہے مجھے امید ہے کہ آپ کمیٹی کی اس پیشکش کو منظور فرمائیں گے اور والد مرحوم کی اس مقدس امانت (مدرسہ امینیہ) کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔
>
> آپ کل ۲۸؍ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ بوقت ۹ بجے صبح دفتر مدرسہ امینیہ میں اپنی

خدمات مفوضہ کی انجام دہی کیلئے تشریف لے آیئے۔ اور امور اہتمام میں میرا ہاتھ بٹایئے میں ممنون ہوں گا”۔

والسلام فقیر احمد سعید مہتمم مدرسہ امینیہ عربیہ

اگر چہ نائب مہتمم کی حیثیت سے بھی انتظام و انصرام کی ساری ذمہ داریاں مولانا واصف صاحب ہی انجام دیتے تھے کہ حضرت مولانا احمد سعیدؒ اپنی دیگر سیاسی مصروفیات کی وجہ سے مدرسہ کو کافی وقت نہیں دے سکتے تھے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ تشریف لے جاتے تھے۔

جمادی الاول ۱۳۷۳ھ (جنوری ۱۹۵۴ء) میں مولانا واصفؔ صاحب نے مدرسہ امینیہ کے لئے جدید دستور العمل مرتب فرمایا۔ اس کا تاریخی نام رکھا:

مکمل ضوابط مدرسہ امینیہ	دستور العمل مدرسہ امینیہ و مسجد پانی پتیاں دہلی
۱۳۷۳ھ	۱۹۵۴ء

اس دستور کی ابتداء میں جو حمد و ثناء لکھی ہے وہ مدرسہ امینیہ کے حوالے سے اہم بھی ہے اور مولانا کے اسلوب نگارش کی غماز بھی ہے۔ اس میں چند خط کشیدہ الفاظ مدرسے کی تاریخ اور اس کے مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھے جائیں تو لطف آئے:

> “تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے جس نے اپنے آئین کو خیر امۃ پر مکمل فرمایا۔
>
> درود اس محمدِ امین پر جو عالم کے لئے رحمت اور آیۂ کبریٰ بن کر آیا۔ سلام اس کے آل و اصحاب پر جنھوں نے روایت سے دین حق کو ہم تک پہونچایا۔ اللہ راضی ہو ان ائمہ مجتہدین سے جنھوں نے درایت سے کھوٹے کھرے کو الگ کر دکھایا۔ اور اپنی کفایت و نصرت سے نوازے ان علماء کو جنھوں نے امت کو کتاب حفیظ کا علم سکھایا اور تدبر فی القرآن و تفقہ فی الدین کا طریقہ بتایا۔”

مدرسہ حسین بخش دہلی کی مجلس منتظمہ کی درخواست پر اس مدرسے کے لئے دستور العمل بھی مولانا واصفؔ صاحب نے ہی مرتب فرمایا تھا۔

ستمبر ۱۹۵۵ء میں حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں مولانا احمد سعیدؒ نے یہ تجویز پیش فرمائی کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اب مدرسے کی تعلیمی و انتظامی ذمہ داریاں مولانا واصفؔ

کے سپرد کردی جائیں اور ان کو مہتمم بنا دیا جائے۔ چنانچہ مجلس کے اتفاق رائے کے ساتھ مولانا واصفؔ صاحب کو عہدۂ اہتمام پر فائز کر دیا گیا اور تمام تعلیمی و انتظامی ذمہ داریاں آپ کو تفویض کردی گئیں جن کو حالات کی نامساعدت اور ''رفقائ'' کی ایذارسانی اور اہل زمانہ کی بے حسی کے باوجود احساس ذمہ داری اور جذبہ خدمت دین سے سرشار ہو کر حسن عمل کے ساتھ ساڑھے ستائیس سال تک انجام دیا۔ اور ۱۹۷۹ء میں مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہو گئے اور خاموشی کے ساتھ خدمت علم اور تخلیق ادب و شعر میں مصروف رہے۔

دورِ اہتمام کے بارے میں حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی فرماتے ہیں:

> ''حضرت مفتی صاحب کے بعد مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ کے منصب اہتمام کو مولانا واصفؔ صاحب نے اپنے والد کی طرح نہایت اعلیٰ نظم و نسق اور صفائی معاملات کے ساتھ چلایا۔۔۔ واصفؔ صاحب سیاسی مصالح کے آدمی نہ تھے سیدھے سچے آدمی تھے۔ اپنی عاقبت بچا کر مدرسہ کے اہتمام کو خواہشمندوں کے حوالے کر دیا اور گوشہ نشین ہو گئے۔ واصفؔ صاحب دیانت وتقویٰ میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ لوچ اور لچک کے قائل نہیں تھے۔ آج کل مدرسہ کا اہتمام اور اوقاف کی تولیت سونے کی چڑیا کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ واصفؔ صاحب کی بعد میں خوشامد کی گئی مگر انھوں نے اس منصب کو نااہلوں کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔۔۔ اپنے اتقا پسند باپ کے متقی بیٹا ہونے کا احساس انھیں شدت سے تھا۔''

ان کو اپنے تقویٰ و دیانت کے سبب مدرسہ کو خیر باد کہنا پڑا تھا۔ جی ہاں! وہ مدرسہ امینیہ جسکے لیے آپ کے والد ماجد حضرت مفتی اعظم نے اپنی زندگی وقف کردی اور پچاس سال اس چمنستان علوم اسلامیہ کی باغبانی کی۔ صدر مدرس، مفتی اور مہتمم رہے۔ خود مولانا واصف صاحب نے اپنے خون جگر سے اسے سینچا۔ فرمایا کرتے تھے آنکھ اسی چہار دیواری میں کھولی، گھٹنیوں بھی یہیں چلے، چلنا بھی یہیں سیکھا، اسی صحن میں بچپن گزارا، ''الف'' ''ب'' کو یہیں پہچانا، فقہ وحدیث کا علم یہیں حاصل کیا۔ فرماتے ہیں:

یہ علم و فضل و حکمت کا مدینہ   یہی ہے میرا مہدِ اولینہ

اسی میں بیٹھ کر سیکھی الف بے　　اسی کے فیض سے روشن ہے سینہ
یہیں حاصل کیا عرفاں خودی کا　　یہیں سیکھا محبت کا قرینہ

(زرگل۔ ص ۱۹۴)

اپنے گہوارہ علمی سے آپ کو جو عظیم الشان نسبت حاصل تھی، جو روحانی و قلبی تعلق تھا اور اس سے علیحدگی کا جو صدمہ اس پیکر دیانت و امانت اور مجسمہ استغناء و خودداری کو پہونچا اس کا اندازہ ان منظومات سے ہوتا ہے جو آپ نے مدرسہ سے مستعفی ہونے کے بعد کہی ہیں۔ آپ کا درج ذیل شعر اس کیفیت کرب کی غمازی کرتا ہے:

یوں جگر تھام کے نکلا ہوں بھری محفل سے　　جیسے ہو گوشت کا ناخون سے جدا ہو جانا

اپنے مہد اولین سے اس دیرینہ و مخلصانہ تعلق کے منقطع ہو جانے کا صدمہ اور افسوس اس قدر تھا کہ فرمایا کرتے تھے یہ حادثہ ہمارے لئے ایسا جانکاہ اور یہ صدمہ ایسا صبر آزما ہے جیسا ایک جوان بیٹے کے اٹھ جانے کا ہوتا ہے۔ بہر حال یہ کوہ الم غم کے ان پہاڑوں میں سے ایک تھا جو ایک غیور و مستغنی باپ کے اٹھ جانے کے بعد ایک خوددار و پاک نفس بیٹے پر وقتاً فوقتاً ٹوٹے اور اس نے کوہ استقامت بن کر ان کو سہا تھا۔

شخصیت:

استغناء و خودداری، امانت و دیانت، حق گوئی و حق شناسی مولانا کی خصوصی شان تھی۔ فرماتے ہیں:

میں بے نیاز تھا اس واسطے رہا معتوب　　وہاں انھیں تھی ضرورت نیاز مندوں کی
دست سوال کیونکر نکلے گا آستیں سے
نم ہو گئی ہیں آنکھیں عزم طلب سے پہلے

آپ عالم دین تھے۔ مفتی تھے۔ فقیہ تھے۔ علوم دینیہ کے ماہر اور اسرارِ پیغام ربانی کے راز داں۔ بلند پایہ ادیب، عالی مرتبہ شاعر، مستند مورخ اور بے مثل محقق تھے۔ بہ یک وقت مفتی اعظم ہند اور نواب سائلؔ دہلوی کے جانشین و یادگار تھے۔

مولانا کی جامع کمالات ہستی میں اُن بزرگوں اور اہل علم حضرات کے اوصاف

حسنہ کی جھلک نمایاں تھی جن کے دم سے دلّی عالم میں انتخاب قرار پائی اور دلّی کہلائی۔

جہاں آپ کی آنکھوں نے مسیح الملک حکیم اجمل خان کی شان و شوکت دیکھی تھی وہیں حضرت مفتی اعظم کی سادی درویشانہ مگر رعب و دبدبہ والی زندگی کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ آپ نے حضرت سائلؔ دہلوی کی صحبتوں میں اپنے ذوق شعر کو آسمان سخن کی بلندیوں پر پہونچایا اور خواجہ حسن نظامی کی بزم آرائیوں سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ آپ کے کانوں میں اب بھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا آزاد، مولانا احمد سعید دہلوی سحبان الہند کی شعلہ بار تقریریں گونج رہی تھیں۔

آپ نے تحریکات آزادی کے ہنگاموں میں آنکھ کھولی، جنگ آزادی کے بڑے بڑے سپہ سالاروں مولانا آزاد، مفتی کفایت اللہ، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، جواہر لال نہرو، مولانا حبیب الرحمن، مولانا احمد سعید وغیرہ کی ملاقاتیں اور سیاسی سرگرمیاں آپ کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ ڈاکٹر انصاری کی محبت حلم و بردباری آپ کو یاد آتی اور رلاتی تھی۔ مولانا مدنی، مولانا حفظ الرحمن اور مولانا احمد سعید کی شفقتیں آپ بھول نہ سکتے تھے۔

خطۂ کوچہ چیلان اس وقت دہلی کا مدینۃ الحکمۃ بنا ہوا تھا مفتی کفایت اللہ، ملا واحدی، علامہ راشد الخیری، مولانا احمد سعید، بیرسٹر آصف علی وغیرہ جیسے صاحبان علم و ادب حکیم مومنؔ خاں کے اس تاریخی کوچہ کو رونق بخش رہے تھے۔ اور ان بزرگوں کے دم سے یہ کوچہ مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ اس علمی و تہذیبی ماحول میں مولانا کی تربیت ہوئی۔ اس طرح مولانا کی شخصیت مشرقی تہذیب و تمدن اور ان اقدار کا نچوڑ تھی جن پر دلّی والوں کو ناز تھا۔

مفتی صاحب کی دوسری گرفتاری کے موقع پر لاٹھی چارج کے وقت مولانا عبد الحلیم، ماسٹر ہلال احمد زبیری اور مولانا واصفؔ دہلوی جنگ آزادی کے جلیل القدر سپہ سالار کو گھیرے میں لے کر لاٹھیوں کے مقابلے پر سینہ سپر ہو گئے۔ تینوں حضرات کے شدید چوٹیں آئیں۔ مولانا واصفؔ کے شانے میں بہت زبردست چوٹ لگی اور کئی ماہ کے علاج معالجہ کے بعد درد اور تکلیف کم ہوئی۔

ملک آزاد ہوا۔ تقسیم ہوا۔ نفرت و تعصب کی آگ بھڑک اٹھی۔ آبادی کا تبادلہ ہوا۔

کیا کیا نہ ہوا۔ خاندان ٹوٹ گئے بکھر گئے۔ یہاں تک کہ حضرت مفتی اعظمؒ کے اہل خانہ بھی آپ کو چھوڑ کر پاکستان منتقل ہو گئے۔ اُس وقت صرف مولانا واصفؔ صاحب ہی مفتی صاحب کے ساتھ دہلی میں رہے۔ اور ایک عظیم باپ کے لائق و فاضل قدر شناس بیٹے نے ان کو آخری وقت میں چھوڑا نہیں اور ان کے علمی و ادبی آثار کی ترتیب و اشاعت کو اپنی زندگی کا اہم مقصد بنایا۔ حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کو تلاش کر کر کے محفوظ کر دیا اور یوں فقہ حنفی کا ایک بیش قیمت خزانہ ضائع ہو جانے سے بچا لیا۔

آزادی سے پہلے مولانا کی شخصیت جن اعلا قدروں کی آئینہ دار رہی تھی آزادی کے بعد بھی ان بیش بہا قدروں کی امانت دار رہی۔ البتہ آزادی کے بعد جو تہذیبی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کو مولانا نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ وہ دنیا جس کی امتیازی خصوصیات کو اپنی شخصیت میں سمو کر جو ایک تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کی وضعدار علامتی ہستی تیار کی تھی وہ دنیا اب یکسر بدل چکی تھی۔ اس کا تذکرہ ان کی تخلیقات میں جا بجا ملتا ہے۔

اب کہاں واصفؔ ملیں گی وہ گذشتہ صحبتیں
اب وہ باتیں سربسر خواب پریشاں ہو گئیں

تقسیم وطن نے ان کو بہت صدمہ پہونچایا تھا فرماتے ہیں:

اے ہم نشیں وطن کی مرے داستاں نہ پوچھ
لوٹا ہے کس نے آہ! مرا آشیاں نہ پوچھ
اب اجنبی وہ ہوئے جن سے چاہ تھی دل کو
گئے وہ جن سے کبھی رسم و راہ تھی دل کو

اسی کے ذیل میں ایک رباعی بھی پیش ہے:

اب کیا ہوئی وہ شان عزیمت اے دوست   کیوں آج ہے تو مائل رخصت اے دوست
ممکن نہیں یکجائی جبن و ایمان   ہے یاد؟ وہ فرمان نبوت اے دوست

زبان دانی:

علم حدیث، علوم قرآنی، فقہ، افتائ، تاریخ اسلام، فلسفہ، منطق وغیرہ منقولات و

معقولات کے علاوہ مولانا واصفؔ دہلوی علم عروض اور عربی فارسی ادب کے ماہر اور اردو زبان ولغت کے فاضل و مستند اہل زبان و زبان داں محقق تھے۔ اہل زبان مرزا یاس لکھنوی کے بقول وہ ہے جس نے زبان سیکھی نہ ہو بلکہ بغیر زبان کی صرف ونحو پڑھے اردو زبان میں گفتگو کرتا رہا ہو۔ اور زبان داں وہ ہے جو اہل زبان ہونے کے علاوہ زبان اردو کی صرف و نحو، ماہیت و ماخذ الفاظ سے بھی واقف ہو۔ زبان داں ہونے کے لئے تحقیق و تدقیق شرط ہے (چراغ سخن)۔ اور یہ خصوصیات مولانا واصفؔ دہلوی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

> ”وہ (مولانا واصف دہلوی) بلاشبہ عربی فارسی اور اردو تینوں علوم میں خاک دہلی کے آخری فرزند تھے۔ اُن کے بعد اِن علوم کے جوہر شناس اور جامع شاید ہی اٹھیں۔“

ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ”مولانا واصفؒ اپنے والد کے ساتھ ایک زمانہ تک کوچہ چیلان میں رہے جس میں مولانا احمد سعید، علامہ راشد الخیری، ملا واحدی، بیرسٹر آصف علی جیسے اصحاب علم اور اہل نظر بھی رہتے تھے۔ اور پورا محلہ گویا ان علم کی پتلیوں سے جگمگاتا رہتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ اور جیسا کہ اس زمانے کی تحریروں اور یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، علامہ نیاز فتحپوری، میر غلام بھیک نیرنگ اور علامہ اقبال جیسے اکابر بھی وہاں وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے۔ مفتی صاحب کا دولت خانہ اہل علم کی نگاہوں کا ہمیشہ مرکز رہا اور جن لوگوں کی وجہ سے اس زمانے کی دہلی کو اعتبار و افتخار میسر تھا ان میں مفتی صاحب کا نام بھی شامل ہے۔“

مولانا کو اردو زبان ولغت کے مسائل، الفاظ کی اصل، لسانیات و قواعدِ زبان پر انتہائی عبور حاصل تھا۔ وہ لغت و زبان کے ماہر اور اس کے کھرے کھوٹے کے پرکھنے والے تھے۔ اِن علوم پر اُن کی جیسی دقیق نظر بہت کم دانشوروں کی ہوتی ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے بقول:

''مولانا واصفؔ دہلوی دہلی کی زبان اور محاورے کے بڑے ماہر تھے۔ بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی اور نواب سائل کی زبان ان کی اپنی زبان تھی۔ پھر وہ عربی فارسی کے عالم تھے تمام ادبی اور فنی نزاکتوں سے باخبر۔ ان کو غلط زبان سے ایسی ہی تکلیف ہوتی تھی جیسے مرزا مظہر جان جاناں کو ٹیڑی چارپائی سے۔''

پروفیسر ابو محمد سحرؔ نے مولانا کی وفات پر راقم الحروف کو تعزیتی خط میں لکھا تھا:

''مکرمی ڈاکٹر صاحب تسلیم۔ حضرت مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی کے انتقال پر ملال سے سخت صدمہ ہوا۔ مولانا ایک بلند پایہ شاعر و ادیب اور ماہر زبان تھے۔ اردو رسم الخط، املا اور زبان کی روایات کے تحفظ کیلئے خاص طور سے ان کے دل میں بڑا درد تھا۔۔۔ ان کی وفات سے اردو زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔''

ڈاکٹر عابد رضا بیدارؔ نے تعزیت نامہ میں لکھا کہ:

''حضرت مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی کی وفات کا علم ہو کر بڑا دکھ ہوا۔ اردو کے ایک جاں نثار عالم واصفؔ صاحب ہمارے ان مغتنمات میں سے تھے جن پر ہم سب کو ناز تھا اور یہ بھروسہ تھا کہ جب بھی کوئی ادبی الجھن درپیش ہوگی واصفؔ صاحب موجود ہی ہیں حل کر دیں گے۔ آپ اپنے شفیق ترین سائے سے محروم ہو گئے اور اردو ادب مفلس تر ہو گیا۔''

اردوئے معلیٰ کی زبان و محاورہ کے سلسلہ میں مولانا واصفؔ دہلوی کا قول سند کا درجہ رکھتا تھا۔ ۵۱۔۱۹۵۰ء میں اردو کے کسی ادیب نے اخبار میں کھانسی آنا لکھ دیا تھا۔ کئی دن تک انجمن ترقی اردو دہلی میں یہ بحث چلتی رہی لیکن مسئلہ حل نہ ہو سکا کہ صحیح محاورہ کیا ہے۔ چنانچہ انجمن کی صدر محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ نے مولانا واصفؔ صاحب سے دریافت کرایا اور مسئلہ طے ہو گیا یعنی ٹکسالی زبان کا محاورہ کھانسی اٹھنا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت نوحؔ ناروی نے مولانا کو لکھا کہ آپ نے اکثر مقاموں پر 'عرض کیا' لکھا ہے۔ کیا عرض آپ کے خیال میں مذکر ہے میں تو مؤنث جانتا ہوں یعنی عرض کی۔

اس کے متعلق ذرا لکھیۓ گا۔ اور گھڑنا درست ہے یا گڑھنا مجھے لکھیۓ کہ میری معلومات میں اضافہ ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لئے اس پر کار بند رہوں۔ مولانا نے ان کو لکھا کہ:

''اس میں شک نہیں کہ 'عرض' مؤنث ہے اور جب یہ لفظ اپنے فعل (یعنی کیا) کا مفعول تسلیم کیا جائے تو بیشک فعل کو مؤنث ہی لانا ہوگا جیسے دعا کی، التجا کی، درخواست کی، التماس کی، انتخاب کیا وغیرہ۔ لیکن میں 'عرض کیا' کو مصدر مرکب سمجھتا ہوں اور عرض کو علیحدہ نہیں سمجھتا۔ عرض کیا کے معنی 'کہا' میں نے کہا۔ میں نے عرض کیا۔ ایسے اور مصادر مرکبہ جو عربی فارسی الفاظ سے مل کر مستقل حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ان کی تذکیر و تانیث اپنے اجزاء ترکیبی کے لحاظ سے نہیں ہوتی جیسے: طلب کرنا۔ میں نے روپیہ طلب کیا (طلب مؤنث ہے) عنایت کیا۔ انھوں نے ایک روپیہ مجھے عنایت کیا۔ (عنایت مؤنث ہے) اسی طرح میں نے یہ تجویز کیا۔ میں نے مضمون ترتیب دیا۔ مکان تعمیر کیا۔ خدا نے دنیا کو تخلیق کیا۔ حکومت ہند نے پاکستان کو تسلیم کیا۔ میں نے عریضہ تحریر کیا یا رقم کیا۔ چپت رسید کیا۔ مسودہ کو نقل کیا۔ وغیرہ میں تمام خط کشیدہ الفاظ مؤنث ہیں۔ مگر فعل مذکر استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان الفاظ کی مستقل تذکیر و تانیث ختم ہو گئی ہے اس وجہ سے کہ محاورہ میں آ کر وہ اردو کے فعل سے مل گئے ہیں اور اب ان کی تذکیر و تانیث مفعول کی تذکیر و تانیث کے ماتحت ہوگی۔ جیسے لشکر ترتیب دیا، فوج ترتیب دی۔ مکان تعمیر کیا کوٹھی تعمیر کی اور مصدر لازم میں فاعل کے لحاظ سے ہوگی۔ جیسے لشکر مرتب ہوا، فوج مرتب ہوئی۔ مکان تعمیر ہوا، کوٹھی تعمیر ہوئی۔ وغیرہ۔ گڑھنا نہیں بلکہ گھڑنا ہی دلّی کی زبان ہے۔''

مولانا واصف دہلوی کے نظریات ارتقائے زبان:

مادری زبان محض اظہار جذبات اور مافی الضمیر ادا کرنے کا آسان وسیلہ ہی نہیں بلکہ قوم کی تہذیبی و ثقافتی اقدار اور ذہنی معیار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہر زندہ زبان بتدریج ارتقاء

”کے منازل طے کرتے کرتے نکھرتی ہوئی اس شکل تک پہنچتی ہے جسے اُس کی ترقی یافتہ صورت کہا جاسکتا ہے اور ترقی اُس تبدیلی کا نام ہے جو بہتری کی طرف راہنمائی کرے نہ کہ کمزوری اور کمتری کی طرف۔

اردو زبان کی اصل جو بھی ہو لیکن یہ موجودہ صورت میں ایک موڈرن اور ایسی زبان ہے جو مختلف قوموں، مختلف علاقوں، مختلف مذہبوں کے مختلف بولیاں بولنے والے لوگوں کے ملنے جلنے سے وجود میں آئی تھی۔ اور داغ تک پہنچتے پہنچتے خوب ستھر نکھر چکی تھی۔ پھر داغ دہلوی نے اس کی شیرینی وحسن کو چار چاند لگائے اور فصاحت وبلاغت کی بلندیوں پر پہنچایا۔

داغ اسکول کے محترم ومعتبر شاعر مولانا واصف دہلوی نے اپنی دینی وعلمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی سینے سے لگائے رکھا۔ مولانا کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف جمیل مہدی مرحوم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> ”ان کا شمار ایک طرف تو داغ اسکول کے نامور ترجمانوں اور صاحب دیوان شاعروں میں ہونے لگا اور دوسری طرف وہ اردو بول چال اور نثری ادب کے ماہر اور مستند اہل قلم تسلیم کیے گئے“

(برہان دہلی۔ اپریل ۱۹۸۷ء)

مولانا واصف دہلوی کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے الفاظ میں:

> ”مولانا واصف دہلی کی شستہ اور فصیح اردو بولتے تھے زبان وبیان کے سلسلہ میں انھوں نے روزمرہ اور سادہ زبان پر جہاں توجہ کی ہے وہاں محاوروں اور تشبیہات کو اپنی شاعری کا ایک حصہ بنادیا ہے“۔

(برہان دہلی۔ اپریل ۱۹۸۹ء)

مولانا جو کچھ لکھتے ہیں نظم ہو یا نثر اس کا مقصد ٹکسالی زبان کی صحت، فصاحت اور شستگی کا تحفظ ہوتا ہے۔ اگرچہ مولانا کا خیال ہے کہ ان کو اپنی تحریروں اور ادب وشعر سے اردو ادب میں اضافہ مقصود نہیں بلکہ وہ قوم کی زبان اور اخلاق کی تہذیب واصلاح کے لئے

اپنے جذبات واحساسات اور تجربات کو بے کم وکاست پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن صالح ادب کی تخلیق کسی بھی زبان کے ادب میں بہترین اضافہ نہیں تو اور کیا ہے، خواہ نثر وشعر کی شکل میں ہو یا تنقید و تحقیق کی صورت میں۔ مولانا کی تحریریں اپنے موضوع پر ان کی شدت احساس اور اپنی زبان کے تحفظ کے جذبے کی عکاس ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ”زبان کے بارے میں یا جس موضوع پر جو کچھ عرض کرتا ہوں اس کی بنیاد خلوص اور نیک نیتی پر ہے... ہر شخص کو اپنی مادری زبان سے محبت ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہے۔ اس کی مظلومیت مجھے صاف گوئی پر آمادہ کرتی ہے“۔
>
> (برہان دہلی۔ جون ۱۹۸۵ء)

اردو زبان کی پیدائش، جائے پیدائش، ارتقاء اور درست زبان کی حفاظت اور اس کے چلن کی کوشش کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

> ”یہ ایک لسانی کلیہ ہے کہ نئی زبان ہمیشہ مختلف قوموں کے اشتراک اور اختلاط سے بنتی ہے۔ قانون سے نہ کوئی زبان بن سکتی اور رائج ہو سکتی ہے اور نہ مٹائی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے عہد حکومت میں سرکاری زبان فارسی وغیرہ رہی اور انگریزوں کے دوسو برس کے زمانۂ عروج میں انگریزی کا عروج رہا لیکن نہ فارسی ہندوستان کی ملکی زبان بن سکی نہ انگریزی۔ بلکہ ایک بین الاقوامی زبان خود بخود بن گئی۔ اور یہ زبان سب سے بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا تمدن جدا جدا نہیں ہے“۔ (تذکرۂ سائل ص ٦)

مولانا کو اخلاقی وتہذیبی قدروں کی طرح اپنی مادری زبان اردو سے بھی پیار ہے وہ اس کی فصاحت و بلاغت اور صحت وشیرینی کو تسہیل زبان کے نام پر قربان کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ زبان کو آسان اور عام فہم بنانے سے ان کی مراد ہوتی ہے کہ تحریر وتقریر میں عربی فارسی وغیرہ کے مشکل الفاظ نہ استعمال کیے جائیں بلکہ ایسے الفاظ وتراکیب کو اپنی نگارش کا حصہ بنایا جائے جو پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت بآسانی سمجھ سکے۔ اس سے زبان کی ترویج وترقی میں مدد ملے گی، نہ کہ اس کے قواعد واملا میں تسہیل کے نام پر اصلاح وتبدیلی

کی جائے اس سے زبان آسان نہیں ہوتی بلکہ اس کی فصاحت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ قواعد زبان کی حدود میں رہتے ہوئے اگر زبان کی بہتری اور ضرورت کے تحت کوئی ایسی تبدیلی یا اضافہ ہو جو پڑھنے اور سننے والوں کو گراں اور اجنبی نہ محسوس ہو اور جمہورِ اہل زبان کے نزدیک مقبول ہو تو اس تبدیلی کو ترقیٔ زبان کی طرف پیش قدمی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ تبدیلی عمومی طور پر اہل زبان کے نزدیک قابل قبول نہ ہو بلکہ ناپسندیدہ ہو تو یہ تبدیلی ترقیٔ زبان نہیں بلکہ جدت برائے جدت ہوئی۔ لیکن قواعد زبان کی پابندی اس سختی سے بھی مناسب نہیں کہ وہ زبان کی ترقی کی راہ میں حائل ہو جائے۔ اس بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

> ”قواعد کی خاطر ارتقائے زبان پر پابندیاں بھی نہیں لگائی جا سکتیں اور قواعد و قیاس کو کسی اختراعی لفظ یا ترکیب کی فصاحت کا فیصلہ کرنے کیلئے حکم بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن ارتقائے زبان ہے کیا چیز؟ اگر ہر قسم کی تبدیلی یا اختراع و جدت کا نام ارتقائے زبان ہے تو بیشمار گھناؤنے الفاظ اور مکروہ محاورے بزم فصاحت کے مسند نشین ہو جائیں گے اور ذوق سلیم کسی گوشے میں بیٹھ کر آنسو بہاتا رہے گا۔ اردوئے معلیٰ کی فریاد کون سنے گا“۔
>
> (ادبی بھول بھلیاں ص ۳۱)

مثلاً اردو میں جھپٹا مارنا، ہاتھ مارنا وغیرہ محاورے ہیں اور صحیح و فصیح ہیں لیکن اس پر قیاس کر کے بہت سے غلط محاورے ایجاد کر لیے گئے ہیں جو قابل ترک ہیں مثلاً ڈینگ مارنا، گپ مارنا، دھاوا مارنا، بریک مارنا، نعرہ مارنا، ٹوٹل مارنا وغیرہ جبکہ ان کی صحیح صورت یہ ہے: ڈینگ ہانکنا، گپ ہانکنا یا گپیں لڑانا، دھاوا کرنا، بریک باندھنا یا بریک لگانا، نعرہ لگانا، ٹوٹل کرنا۔

گزشتہ سطور میں عام اہل زبان سے مراد عوام نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اہل زبان ادیبوں شاعروں کی عمومیت ہے۔ اور کسی لفظ یا محاورے کی فصاحت معلوم کرنے کے لئے لغت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اگر کسی سے کوئی لفظ سنا اور اس کی درستی یا نادرستی کے بارے میں شک ہوا تو لغت یہ مسئلہ حل کرتا ہے۔ عوام کی بولی اور زبان کو فصاحت کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

''عوام جس طرح بولتے ہیں بولنے دیجیے۔ لغت تو ہوتا ہی اس لئے ہے کہ اگر کسی لفظ کی صحت و عدم صحت، فصاحت و عدم فصاحت میں شک ہو تو لغت میں دیکھ کر معلوم کر لیا جائے'' (ادبی بھول بھلیاں ص ۱۸)

تبدیلی اور تغیر علامت زندگی ہے۔ اور اردو ایک زندہ زبان ہے۔ اس میں بھی بہر حال تبدیلی ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی لیکن اس طرح کے الفاظ و محاورات قابل تسلیم نہیں ہو سکتے جو کسی زبان سے لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیے گئے ہوں ''مثلاً جلسہ ہونے جا رہا ہے'' یا جلنا اور حسد کرنا کے بجائے سڑنا، مجھے، تجھے کی جگہ میرے کو تیرے کو، وغیرہ۔ اس تبدیلی کے متعلق مولانا کی رائے بہت اہم اور غور طلب ہے:

''زبان کی ہر قسم کی تبدیلی کا نام ارتقا رکھ دینا، یہ فلسفیانہ نظریہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے... ایسی کارروائیاں اصلاح و تہذیب کے دائرے میں نہیں آتیں بلکہ ادب کو فاسد کرتی ہیں''۔

(ادبی بھول بھلیاں ص ۱۱)

ایک اور موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

''اردو زندہ اور توانا زبان ہے۔ دوسری زبانوں کے جو الفاظ اردو نے اپنا لیے ہیں اور ان میں تصرف کر لیا ہے خواہ لغت کے لحاظ سے غلط ہوں، اگر فصحا و ادبا سے سند فصاحت حاصل کر چکے ہیں تو ان کو اصل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں... وہ حضرات جو صحت الفاظ پر اصرار کرتے ہیں مجھے ان کی رائے سے اختلاف تھا اور ہے... لیکن میں اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اردوئے معلیٰ جیسی شیریں، فصیح و بلیغ اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کو کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بنا دیا جائے اور جھلی والوں، خوانچہ والوں اور راہ گیروں کو فصاحت کی سند تقسیم کر دی جائے''۔

(ادبی بھول بھلیاں ص ۷)

استاد داغ نے اردو زبان کی فصاحت کا جو معیار مقرر کر دیا وہ آج تک قائم ہے۔ اس بات کو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے یوں بیان کیا ہے:

> ”یہ دلچسپ بات ہے کہ تاریخ ادب میں بڑے بڑے شاہنشاہان سخن موجود ہیں مگر جب سند کا مسئلہ آتا ہے تو غیر متنازعہ ذات صرف داغ کی نظر آتی ہے“۔
> (تبصرہ بر ”اردو مصدر نامہ“)

اردو کی موجودہ ترقی یافتہ فصیح ٹکسالی شکل کا سہرا فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے سر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ”اردو زبان کی ادبی حیثیت آج تک وہی ہے جو داغ نے قائم کی تھی جس نہج پر داغ نے زبان کو نکھارا اور لغات و تراکیب کو مرتب کیا اس سے بہتر تبدیلی ابھی تک نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے زبان کے اس آخری دور کے مورث اعلیٰ صرف داغ مرحوم ہی کو کہا جا سکتا ہے۔ داغ مرحوم اور ان کے تلامذہ دورِ حاضر کی عالمگیر اور صالح زبان کے معمار ہیں... جنھوں نے ہندوستانی زبان و ادب کو نکھار کر ایک بین الاقوامی زبان بننے کے قابل بنایا“۔ (تذکرۂ سائل ص ۸ و ۹)

اردو زبان کی بقا و ارتقا میں بنیادی اہمیت اس کے رسم الخط کو حاصل ہے اس لئے اردو کے رسم الخط (نستعلیق) کا قائم رہنا زبان کی بقا کیلئے ضروری ہے۔ نستعلیق نہایت شستہ، شائستہ و حسین طرزِ تحریر ہے۔ اس کی خوبصورتی اور نازکی کو قائم رکھنا تحفظ زبان اردو کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے تحریر فرمایا:

> ”دنیا کی تمام زبانوں میں سے کسی زبان کا رسم الخط نستعلیق کی لطافت و نزاکت اور تناسب پیوندیدگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چھوٹے چھوٹے شوشوں سے بڑے بڑے حرفوں کا کام لیا جاتا ہے۔ شوشوں کی نوک پلک اور وضع و ہیئت پر حسن خط کا مدار ہے“۔ (ادبی بھول بھلیاں ص ۶۳)

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ شاعر پیدائشی طور پر شاعر ہوتا ہے۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے: A poet is born , not made لیکن آج کل شاعر بہت تیزی سے بن رہے ہیں اور شعروں میں عجیب و غریب زبان اور اجنبی الفاظ و محاورات استعمال کر رہے ہیں۔ شعر کہنے سے پہلے زبان پر قابو اور قدرت ضروری امر ہے مولانا کے نزدیک غلط زبان

میں شعر کہنے سے اچھا یہ ہے کہ شعر کہا ہی نہ جائے کہ یہ زبان و ادب کی خدمت نہیں بلکہ موجب نقص ادب ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''ضرورتِ شعری کی وجہ سے زبانِ ولغت کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ لفظ ازروئے قواعد غلط یا فصاحت سے گرا ہوا نہ ہو۔ اور محاورے کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے''۔
>
> (مضمون 'لغات کی تحقیق'۔ کتاب نما اگست ۱۹۸۶ء)

شعر میں فن پر مضبوط گرفت کے ساتھ ساتھ زبان و محاورہ پر کامل دستگاہ داغؔ اسکول کے شعراء کی خصوصیت ہے۔ مولانا واصفؔ دہلوی کی شاعری میں بھی صحتِ زبان ولغت امتیازی وصف ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم فرماتے ہیں کہ اردو کے شاعروں کو ٹکسالی زبان سیکھنے کے لئے جن شعراء کا بطورِ خاص مطالعہ کرنا چاہئے ان میں مولانا واصفؔ دہلوی اہم شاعر ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ:

علم تاریخ سے عموماً اور شاہجہان آباد کی تاریخ سے مولانا کو خصوصی دلچسپی تھی۔ بچپن میں ہم اکثر ابا جان کے ساتھ دہلی کے تاریخی مقامات یعنی شوکت وعظمت رفتہ کے کھنڈر دیکھنے جاتے تھے۔ حضرت والد محترم ان عمارتوں کی تاریخ بڑی تفصیل سے بیان فرماتے تھے۔ کس نے بنوائی، کب بنی شروع ہوئی، پتھر کہاں سے منگوایا گیا، معمار اور انجینیر کون لوگ تھے اور کہاں سے بلائے گئے تھے، کتنی لاگت آئی، چشم فلک نے اس پر کیا کیا دور گزرتے دیکھے اور اس کے ساتھ کیا کیا غلط روایتیں منسوب کی جاتی ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے وغیرہ۔ دہلی چونکہ علمی اعتبار سے بھی مرکزی حیثیت رکھتی تھی اور سیاسی اعتبار سے بھی مولانا اس مدینہ علم کی اینٹ اینٹ سے واقف تھے۔

علم کے اس میدان میں بھی آپ کا فرمایا ہوا ایک ایک لفظ مستند تھا کہ بغیر تحقیق و تلاش کے کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ آپ کے اس وصف کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور مؤرخ ومحدث مولانا سید محمد میاںؒ الجمعیۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

> "حضرت مولانا واصف صاحب حضرت مفتی صاحبؒ کی مفصل سوانح حیات بھی تحریر فرما رہے ہیں۔ آپ کی تحقیقی اور تنقیدی نظر ہمیں یقین دلاتی ہے کہ یہ مجموعہ صرف ایک بزرگ کا تذکرہ نہیں بلکہ ہندوستان اور مسلمانان ہند کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا اہم باب ہوگا۔"

جب مولانا واصف دہلوی مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی نے مدرسہ امینیہ کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھا جو ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ "البلاغ" بمبئی میں شائع ہوا تو تعارف کے طور پر مدیر مولانا حامد الانصاری غازی نے مندرجہ ذیل عبارت تحریر کی تھی:

> "مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصف حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ کی یادگار ہیں۔ موصوف نے علم و تحقیق کی پوری توانائی سے کام لے کر مندرجہ ذیل معلوماتی اور تاریخی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا اور ارتقا دونوں شاہجہان آباد دہلی کی علمی عظمت پر شاہد و عادل ہیں۔ ولی اللہی خاندان کے تذکرہ کے بغیر دینی تعلیم کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس خاندان کی مرکزی شخصیتیں دلّی جیسے مرکزی شہر میں ابھریں اور علم و فکر اور دین و دانش کی دنیا پر چھا گئیں۔ واصف صاحب نے مضمون مدرسہ امینیہ پر لکھا ہے مگر دہلی مرحوم کا پورا تذکرہ اس میں آ گیا ہے جس نے مضمون کی قدر و قیمت کو بلند سے بلندتر کر دیا ہے۔"

حضرت مفتی صاحب بھی تاریخ کے مطالعہ اور اس پر مولانا واصف کی گہری نظر اور دلچسپی کی قدر اور اس پر اعتماد فرماتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے سوانح مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کی ترتیب و تالیف کے دوران کچھ سوالات مدرسہ دارالبقاء وغیرہ سے متعلق حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں بھیجے تو ان کا جواب لکھنے کے لئے حضرتؒ نے واصف صاحب کا انتخاب کیا۔ چنانچہ واصف صاحب نے ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر مولانا موصوف کو ارسال کیا اور مولانا گیلانی نے اس کے لئے اپنی کتاب میں مولانا واصف صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور مولانا کو علیحدہ خط لکھ کر بھی ممنونیت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اس مکتوب سے ایک اقتباس:

> ''الکریم ابن الکریم کرمفرمائے بندہ حضرت واصفؔ صاحب ایدکم اللہ بروح منہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ کی خدمت بابرکت میں پہلے تو یہ خوشخبری پہونچانے کی عزت حاصل کرتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر النانوتوی مولانا محمد قاسمؒ کی سوانح عمری اپنی آخری منزل پر پہونچ چکی ہے میں آپ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ کے والد قبلہ مدظلہ العالی حضرت مفتی صاحب سے دو سال پہلے اسی سلسلہ میں چند سوالات خاکسار نے کیے تھے۔ ان سب کا تحقیقی جواب کافی محنت ومشقت برداشت کرکے آپ نے دیا تھا جن سے اپنے تصنیفی سفر کی متعدد منزلوں میں غیر معمولی راہ نمائیاں مجھے حاصل ہوئیں...''

چند لطیف واقعات:

انجمن اتحاد منزل پہاڑی بھوجلہ دہلی میں سیرۃ النبی کا ایک جلسہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں اکابر علماء کی تقریر ہوتی تھی۔ کبھی مولانا حسین احمد مدنی کی، کبھی قاری طیب صاحب کی۔ یہ جلسہ مولانا واصفؔ دہلوی کی صدارت میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا مدنی کی تقریر تھی۔ جلسہ کی ابتداء میں قاری فرید احمد دہلوی نے نعت پڑھی۔ قاری فرید دہلی کے ایک اچھے قاری اور خوش الحان نعت خواں تھے۔ مولانا نے دوران تقریر فرمایا کہ عجیب لوگ ہیں ڈاڑھی منڈاتے ہیں اور نعتیں سناتے پھرتے ہیں۔ قاری فرید صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بہت پریشان اور بے چین ہوئے۔ اور صاحب صدر مولانا واصفؔ صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ مولانا کو بڑی غلط فہمی ہوئی۔ وہ سمجھے کہ میں ڈاڑھی منڈاتا ہوں جبکہ وہ تو ابھی تک نکلی بھی نہیں ہے۔ مولانا واصفؔ صاحب نے فرمایا اس وقت خاموش ہوجاؤ۔ کل میرے ساتھ چلنا میں غلط فہمی دور کرادوں گا۔ دوسرے دن ان کو مولانا مدنی کی خدمت میں لے گئے اور مولانا مدنیؒ سے عرض کیا حضرت یہ قاری فرید احمد ہیں کل جلسہ میں نعت انھوں نے ہی پڑھی تھی۔ اس وقت یہ دعا کی درخواست کرنے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ان کے حق میں دعا فرمادیں کہ ان کی ڈاڑھی نکل آئے نکلتی ہی نہیں ہے۔

قاری صاحب کے ڈاڑھی ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔

جب جوش ملیح آبادی رسالہ 'آجکل' کی ادارت کے زمانے میں دہلی میں مقیم تھے تو ایک مرتبہ مولانا واصف دہلوی ان سے ملنے گئے۔ علیک سلیک کے بعد جوش نے تقدیر و تدبیر کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اور کہا میں اس مسئلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا تھانوی، مولانا احمد سعید اور آپ کے والد مفتی کفایت اللہ سے گفتگو کر چکا ہوں لیکن یہ حضرات مجھے مطمئن نہ کر سکے۔

مولانا حیران تھے کہ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ پہلے ان کی تقریر سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو فرمایا:

> ''حضرت ہم تو ایک طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوئے تھے کہ کچھ کلام آپ سے تبرکاً سنیں گے اور کچھ اپنا کلام بغرض اصلاح پیش کریں گے۔ رہا یہ مسئلہ تو جب جلیل القدر علماء کرام سے آپ مطمئن نہیں ہو سکے تو ہم کیا کر سکیں گے۔ لیکن ایک بات ہے کہ آپ نے ہر طرح کوشش اس کو سمجھنے کی کر لی، کسی عالم کو نہ چھوڑا، تو یہ تو تھی آپ کی تدبیر۔ اور سمجھ میں آپ کی آج تک نہ آیا یہ ہے آپ کی تقدیر۔''

یہ کہا اور جوش کو حیرت زدہ چھوڑ سلام کر واپس تشریف لے آئے۔ مشاعروں کے علاوہ جوش سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد رسالہ 'آجکل' کے وسیلہ سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔

ایک بار منشا بنگلوری دہلی آئے ہوئے تھے۔ اردو بازار میں مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ واصف صاحب نے ان کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ فرمایا میں مدینہ بک ڈپو کے اوپر بالاخانے میں رہتا ہوں، تشریف لائیے گا۔ اس پر منشا صاحب نے کہا ''تو ماشاء اللہ آپ مدینہ کے اوپر رہتے ہیں۔'' مولانا نے جواب دیا ''جی ہاں! جس طرح پھول پر بھنورا۔''

اور عشق رسول آپ کی نعتوں سے بھی جھلکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

واصف اگر نہیں ہے تمھیں تاب انتظار   خود کو مٹا کے دیکھ لو صورت رسول کی
وہ غبار کوئے حضرت کس کو ہوتا ہے نصیب   ہاں لگا دو میری آنکھوں سے یہ اپنا پیرہن

حضرت مولانا زید ابوالحسنؒ فاروقی نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ وفات سے کوئی پندرہ بیس دن پہلے مولانا واصفؔ صاحب تشریف لائے تھے۔ بڑے مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ عالم تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، اعلیٰ درجہ کے خوشخط اور ذوق لطیف کے مالک تھے۔ آپ نے اپنا ایک شعر سنایا۔ مولانا زید صاحب کے ایک عزیز کوئٹہ سے آئے ہوئے تھے، انھوں نے کہا بہت عمدہ شعر ہے اپنے پاس لکھ لوں۔ اس پر حضرت مولانا زید صاحب نے فرمایا میاں تم کیا لکھو گے خود ان کے قلم سے لکھواؤ۔ جس اعلیٰ پائے کا شعر ہے اسی درجہ کے خط میں لکھواؤ اور یادگار کے طور پر رکھو۔ اس وقت میں بھی والد صاحب کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد بھی مولانا زید صاحب نے یہ واقعہ میرے سامنے دوہرایا لیکن اتفاق سے شعر ان کو بھی یاد نہ آیا اور میں بھی بھول گیا۔

حضرت مولانا زید فرماتے تھے کہ:

> "جب مولانا واصفؔ صاحب کفایت المفتی کی ترتیب وتدوین فرمارہے تھے میں ایک دن ان کے مکان اردو بازار گیا۔ مولانا نے فتاویٰ کی ترتیب وتبویب دکھائی۔ بڑی خوشی ہوئی۔ مولانا نے بڑے سلیقہ سے مرتب ومبوب فرمایا ہے۔ میں حیران رہ گیا اتنا عظیم اور مشکل کام تنہا ایک فرد نے کس خوبی سے انجام دے دیا ہے۔"

حضرت والد ماجد کی وفات کے بعد میں ایک روز حضرت مولانا زیدؒ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے گلے لگایا، تسلی دی اور فرمایا:

> "بیٹا! دلّی علماء سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ دلّی میں چار عالم ایسے تھے جن کی موجودگی کے احساس سے دل بندھا رہتا تھا۔ ایک مولانا عبدالدائم، دوسرے مولانا واصفؔ، تیسرے مفتی عتیق الرحمن اور چوتھے قاضی سجاد۔ آہ! تین اللہ کو پیارے ہوگئے۔"

یہ کوئی بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے اب تو دہلی اس درجہ کے علماء سے خالی ہوچکی۔ چند ماہ پیشتر اس سلسلہ کی ایک آخری نشانی مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی بھی ۱۳/ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مولانا واصفؔ صاحب کی تدفین کے وقت علی محمد صاحب شیر میوات نے حاضرین کو مخاطب کر کے تقریر کی اور کہا کہ حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمان واصفؒ دہلوی نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر حضرت شیخ الاسلام نے یہ دی تھی کہ حضرت مفتی اعظم کا جسم تو مہرولی میں ہے لیکن حضرت کی روح حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ ہے تو مفتی واصفؔ صاحب کی شکل میں حضرت مفتی اعظمؒ کی روح آج مہندیوں میں آ گئی ہے۔

مولانا کی زندگی کے بہت سے گوشوں مثلاً مصائب و آلام کے وقت ان کی ثابت قدمی اور بغض وحسد رکھنے والوں کی اذیت ناکیوں کے ذکر کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے کہ اب مولانا بھی جنت کو سدھارے اور وہ لوگ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن ان کی شخصیت کے اس پہلو پر مولانا محمد سالم صاحب قاسمی کے ایک مضمون سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے مولانا واصفؔ دہلوی کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ جو حضرات مولانا واصف کو قریب سے جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا سالم صاحب نے کس جامع انداز میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ”... حضرت مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی بھی انھیں یادگار شخصیات میں سے ایک مغتنم شخصیت تھے کہ جو علماً، عملاً، فکراً، ذوقاً اور دیانۃً ذوق اسلاف کے عموماً اور اپنے والد ماجد فقیہ الامت حضرت مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق کے خصوصاً حامل تھے اسی کے ساتھ حق گوئی ان کا وہ امتیازی وصف تھا کہ جس کی بطور خاص اجتماعی خدمات کے ذیل میں انھیں بار بار بڑی اور ایسی گرانبار قیمت ادا کرنی پڑی کہ جس سے وہ برسوں پنپ نہ پائے۔ اس گرانباری ماحول کا ان کی ذات اور ذاتی زندگی پر جو بھی اثر پڑا ہو وہ تو پڑا ہی ہوگا لیکن بیذوق ساغر و پیمانہ بدست خود غرضوں کے پیدا کردہ ذہنی، فکری اور ماحولی انتشار کے نتیجے میں ان کے بہت سے ایسے قیمتی علمی، ادبی، فقہی اور دینی حقائق و لطائف سے ملت کی محرومی ایک ناقابل تلافی نقصان ہے کہ جن کی ندرت و افادیت کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت مفتی واصف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے موجود آثار علمیہ کو شاہد عدل قرار دیا جا سکتا ہے۔“

شعر گوئی کی ابتدا:

واصفؔ صاحب نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور فارسی زبان میں حمد سے ابتدا کی۔ 'زرگل' میں صفحہ ۸ پر یہ حمد درج ہے۔ اس پر مولانا نے نوٹ لکھا ہے:

"یہ نظم میری سب سے پہلی شاعری ہے۔" اس کا ایک شعر پیش ہے:

نباشد عقل را نیروئے پرواز
ز بے بال و پری در خلوت راز"

اردو میں اولین شاعری بشکل مرثیہ 'یادِ اجمل' بروفات مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ دہلوی ۲۲ رجنوری ۱۹۲۸ء کے سہ روزہ الجمعیۃ دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ حضرت مولانا احمد سعیدؒ نے حضرت مفتی اعظمؒ کو دکھایا کہ حفیظ الرحمان نے حکیم صاحب کا مرثیہ کہا ہے۔ مفتی صاحب نے ملاحظہ فرمایا اور سراہا۔ اس مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ ہو:

زمین ہند پر برپا قیامت خیز طوفاں ہے
لبوں پر نالہ و شیون دلوں میں سوز ہجراں ہے
اسیر درد کی قسمت پہ ناکامی بھی خنداں ہے
یہ صورت دیکھ کر دیدہ سیہ بختوں کا گریاں ہے
صدائے درد غم بگرفتہ مشرق را و مغرب را
کہ ماوائے نماندہ مجد و فضل و حکمت و طب را

مولانا واصفؔ دہلوی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن اکثر اصناف سخن مثلاً نظم، قصیدہ، مرثیہ، مسدس، رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔ شروع میں آصفؔ تخلص اختیار کیا تھا۔ اور ۴۵-۱۹۴۴ء تک یہی تخلص رہا۔ پھر استاد محترم نواب سائلؔ دہلوی کے مشورہ سے واصفؔ کر لیا۔ اور "زرگل" میں شائع شدہ ایک یا دو نظموں کو چھوڑ کر تمام غزلوں میں واصفؔ ہی لکھا ہے۔

تلمذ:

مولانا واصف دہلوی نے فصیح الملک نواب مرزا خان داغ دہلوی کے شاگردِ رشید ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی سے مشورہ سخن کیا۔ فرماتے ہیں:

قدر اس لئے کرتے ہیں سخنور میری
سائل سے تلمذ ہے سخن میں مجھ کو

اول تو ذوق شعروادب والد بزرگوار سے ورثہ میں ملا کہ حضرت مفتی صاحبؒ عربی فارسی کے اعلیٰ درجہ کے شاعر وادیب تھے۔ ''زرگل'' کے دیباچہ میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت والد ماجد مفتی اعظم علامہ مولانا محمد کفایت اللہ نور اللہ مرقدہٗ اللہ کو پیارے ہوئے جو عالم اسلام کے ایک مایۂ ناز فقیہ ومحدث ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ ادیب اور عربی فارسی کے شاعر تھے اوران کے زیر سایہ میری گھٹی میں ادبی ذوق شامل ہوا۔''

دوسرے حضرت سائل جیسے شفیق استاد کی سرپرستی اور نگرانی حاصل ہوئی تو مولانا واصف دہلویؒ کا شوق سخنوری خوب پھلا پھولا اور وہ داغ کے مکتب سخن کے ممتاز شاعر اور جانشین سائل تسلیم کیے گئے۔

> ''استاد محترم حضرت سائل اعلیٰ اللہ مقامہٗ بھی جنت کو سدھارے جن کی شفقتوں نے میرے ذوق سخن کو پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔'' (زرگل ص ۴)

جنوری ۱۹۲۸ء میں حضرت سائل سے شاگردی کا یہ رشتہ قائم ہوا۔ ''تذکرہ سائل'' صفحہ ۱۰۰ پر لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف غم نصیب واصف کے بزرگوں سے نواب صاحب مرحوم کے مراسم قدیم تھے مگر تلمذ کے ارادے سے جنوری ۱۹۲۸ء میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا بیٹا میں تو خود اس قابل ہوں کہ تمھارے باپ سے اصلاح لوں تم مجھ سے اصلاح لینے آئے ہو۔''

استاد شاگرد کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور شاگرد کی سرشت میں بھی ادب واحترام بزرگان شامل تھا۔ واصف صاحب بھی دیگر شاگردوں کی طرح لال دروازہ نواب صاحب

کے دولت خانہ پر اصلاح لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ استاد دوسرے شاگردوں کو تو ہاتھ کے ہاتھ اصلاح دے کر روانہ کرتے تھے لیکن مولانا کی غزل رکھ لیتے تھے۔ شروع میں تو مولانا اس طریق کار کو برداشت کرتے رہے، آخر نہ رہا گیا تو نواب صاحب سے پوچھا حضور اور شاگردوں کو تو اصلاح فوراً مل جاتی ہے مگر مجھے آپ انتظار کراتے ہیں۔ استاد نے جواب دیا: ''میاں برخوردار! تمھارے باوا سے ڈر لگتا ہے تمھاری غزل غور سے دیکھتا ہوں''۔

غزل پر اصلاح دے کر ملفوف کر کے حضرت استاد محترم اس پر شاگرد کا نام تحریر فرماتے اور جب مغرب کے وقت مولانا کے کتب خانہ رحیمیہ مرحوم اردو بازار تشریف لاتے تو وہ لفافہ عنایت فرمادیتے جس پر لکھا ہوا ہوتا:

''بلمس انامل عزیزی واصفؔ دہلوی سلمہ''

حضرت سائلؔ دہلوی کا یہ معمول تھا کہ روزانہ شام کو رکشا پر بیٹھ کر اردو بازار کتب خانہ پر تشریف لاتے تھے۔ اور پابندی سے اس وضعداری پر معذوری کے زمانہ میں بھی قائم رہے۔ یہ ان کی شام کی تفریح اور اپنے عزیز ترین شاگرد سے ملاقات کا وسیلہ تھا۔

''تذکرہ سائلؔ'' میں صفحہ ۹۵ پر مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''راقم الحروف کو اپنا مرشدزادہ فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میری زندگی کے یہی دو گھنٹے ہیں جن میں میں اپنے آپ کو زندہ تصور کرتا ہوں۔ میں عرض کرتا کہ یہ دو گھنٹے میری سعادت وخوش نصیبی کے ہیں۔ ایک روز جبکہ کتب خانہ کے سامنے رکشا میں تشریف رکھتے تھے حضرت مفتی صاحب تشریف لائے، مزاج پرسی کی۔ نواب صاحب آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا حضرت مفتی صاحب! جی رہا ہوں۔ اور راقم الحروف کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اگر یہ نہ ہوتا تو کبھی کا مر چکا ہوتا۔ اس بچے کے پاس دو گھڑی کے لیے آجاتا ہوں اور اسی وقت میں اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہوں''۔

مولانا واصفؔ صاحبؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''راقم الحروف نے آنکھ اس وقت کھولی جبکہ دہلی مرحوم کے باعظمت ومقدس

> آثار میں سے کچھ تھوڑے سے بچے کھچے اور اجڑے پجڑے آثار باقی رہ گئے تھے۔ شہر شاہجہان آباد کا اجڑا ہوا کھنڈر عظمت رفتہ کا پتہ دے رہا تھا۔''
>
> (دلی والے۔ ص ۷۰ مرتبہ ڈاکٹر صلاح الدین)

انھیں آثار میں سے دلّی کے گلی کوچوں میں منعقد ہونے والی مشاعرے کی محفلیں بھی تھیں۔ تقریباً ہر ہفتہ کئی جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ دریبہ کے ایک جوہری صاحب کے دیوان خانے میں ہر اتوار کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس وقت دہلی میں سائلؔ و ساحرؔ، زارؔ و بیخودؔ، آغا شاعرؔ و کیفیؔ جیسے باکمال استاد شعراء موجود تھے۔ دریبہ کے ہی ایک مشاعرہ میں جو سائلؔ صاحب کی صدارت میں ہوا تھا مولانا واصفؔ دہلوی نے پہلی غزل پیش کی تھی۔ چونکہ اٹھارہ انیس سال کی عمر تھی اساتذہ کے سامنے غزل پڑھتے ہوئے مولانا کو ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی استاد محترم نے اپنے ارشد تلامذہ کی غزل خود پڑھ کر سنائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ ۱۹۴۵ء میں نواب سائلؔ دہلوی اللہ کو پیارے ہو گئے تو سفینۂ داغ کے ایک اور ناخدا حضرت نوحؔ ناروی سے مشورۂ سخن کیا۔

نوحؔ صاحب سائلؔ صاحب کے ہم عصر اور داغؔ کے شاگرد تھے۔ مولانا واصفؔ کے بزرگ تھے نوحؔ صاحب کو جو قلبی تعلق مولانا سے تھا اس کا اندازہ ان خطوط کو دیکھنے سے ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً آپ نارہ سے مولانا کو لکھتے تھے۔ وہ مولانا کو کبھی ''جناب بندہ، آدابِ نیاز'' لکھتے، کبھی ''جناب مولانا واصفؔ صاحب زاد لطفہٗ سلام ودعا'' لکھتے، کبھی ''مولانائے محترم زاد لطفہٗ سلام نیاز'' لکھتے تھے۔ لیکن اکثر ''محب مکرم زاد لطفہٗ۔ سلام شوق'' سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ اور مولانا ہمیشہ ان کو ''مشفق محترم۔ دامت برکاتہم'' لکھا کرتے تھے۔

حضرت نوحؔ ناروی نے مولانا کے کلام ''زرِ گل'' پر پیش لفظ میں تحریر فرمایا:

> ''میں جناب مولانا واصفؔ صاحب سے اس وقت سے واقف ہوں جب بھائی سائلؔ صاحب زندہ تھے۔ پہلی ملاقات مولانا سے بھائی سائلؔ صاحب کے مکان پر ہی ہوئی۔ اس کو میرے خیال میں آٹھ نو برس ہوئے ہونگے۔ اس زمانے میں کئی بار دلّی آیا اور برابر واصفؔ صاحب سے ملتا رہا۔ بھائی سائلؔ

صاحب کی طرح میرا بھی معمول ہے کہ جب تک میں دلّی میں رہتا ہوں بعد نماز مغرب مولانا کے کتب خانے میں روزانہ کچھ دیر کے لئے بیٹھتا ہوں۔ اور اس مختصر سی نشست میں ادبی باتیں خاص طور سے ہوتی ہیں میں نے بیشتر مولانا کا کلام ان کی زبان سے بھی سنا اور رسالوں میں بھی دیکھا میں کہہ سکتا ہوں کہ علاوہ غیر معمولی دینی قابلیت کے انھیں شاعری میں خاص دخل ہے اور یہ ایک ممتاز شاعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔“

جناب عزیز وارثی کے بقول:

> ”پاکستان بننے سے پہلے دلّی کی مخصوص ادبی نشستیں انھیں کی صدارت میں ہوتی تھیں۔ ان نشستوں میں واصفؔ صاحب اپنا کلام بڑے مخلصانہ انداز میں بڑے شیریں ترنم میں سناتے تھے۔ سامعین ایک ایک شعر ان سے بار بار سنتے تھے۔ نواب سائلؔ دہلوی کے ترنم کی رمق اور پھر ان کی سبک آواز اور پاکیزہ لہجہ واقعی سننے والوں کے قلب پر اثر کرتا تھا۔ انھیں طرحی مشاعروں میں شریک ہونا زیادہ پسند تھا مگر ان طرحی مشاعروں میں بھی ان سے غیر طرحی کلام کی فرمائش ہوتی۔“

جن لوگوں نے مولانا کو جوانی کے زمانے میں مشاعروں میں شرکت کرتے ہوئے دیکھا اور ان کو سنا ہے وہ بتاتے ہیں کہ اول تو شعر زبان و بیان، محاورہ، بندش، مضامین، فصاحت و بلاغت اور فنی اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا اس پر یہ کہ منفرد و دلکش ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ بار بار فرمائش ہوتی تھی۔ مولانا واصفؔ دہلوی کے ساتھ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے چند حضرات یہ تھے کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، خواجہ محمد شفیع، پنڈت خارؔ دہلوی، طالبؔ دہلوی، علامہ انور صابری، مخمورؔ دہلوی، شمیمؔ کرہانی، فرقتؔ کاکوروی، شیر سنگھ نازؔ، بسمل سعیدی ٹونکی، کنہیا لال آزردہؔ، ڈاکٹر پریم لال شفاؔ دہلوی، گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی، ساغرؔ نظامی، کیفؔ بھوپالی، رام کشن مضطرؔ، پنڈت گلزارؔ دہلوی، عزیز وارثی، فناؔ نظامی کانپوری وغیرہ۔ ان حضرات میں سے اب صرف حضرت گلزارؔ دہلوی حیات ہیں۔ مولانا کا کلام ”زرِ گل“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ چند اشعار بطور نمونہ

پیش ہیں:

نہ بولو مجھ سے لیکن کیا مجھے دل سے بھلا دو گے
کسی کی یاد مٹ جائے کہیں ایسا بھی ہوتا ہے
تلاش بحر میں قطرے نے کتنی ٹھوکریں کھائیں
سمجھ لیتا جو خود کو بن ہی جاتا بے کراں اب تک
منافی تھا یہ اے منصور دستور امانت کے
کسی کی بات کو یوں اپنے بیگانے میں رکھدینا
کیا بہار اور کیا خزاں واصفؔ نظر کا کھیل ہے
لی جہاں انگڑائی دل نے موسم گل آگیا
مرے سر پھوڑنے کو موجِ بوئے گل ہی کافی ہے
نہیں جوشِ جنوں وابستہ دیوار و در اپنا
کیا پوچھتے ہو اس نگہ ناز کا عالم
اک نغمہ ہے لیکن کوئی آواز نہیں ہے
ستارے یہ ستارے کیا کریں گے رہبری میری
مرا ہر اک قدم خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے
کسی کا نام آتے ہی مہک اٹھتے ہیں صحرا بھی
بہاریں مسکراتی ہیں نظارے جگمگاتے ہیں

آزمائش گہِ غم میں دلِ نازک کو نہ لا   کہ زر گل نہیں ہوتا کبھی معیار طلب
باوفا ثابت ہوا اس بے مروت کا خیال   بے تکلف آگیا خلوت میں دل بہلا گیا
خطا کاروں کی عظمت زاہد معصوم کیا جانے   خطا کی اور زمیں کا بن کے آدم تاجور آیا
اے میری حسرتو! ابھی سو جاؤ رات ہے   یہ آہ کی چمک ہے نمودِ سحر نہیں
کیوں کر بنے گا باعث تنظیمِ میکدہ   انگور کا جو خوشہ نچوڑا نہ جائے گا
راہِ طلب میں خوب خرد کے دیے جلاؤ   لیکن بہر قدم ہے ضرورت رسولؐ کی
واصفؔ اگر نہیں ہے تمھیں تاب انتظار   خود کو مٹا کے دیکھ لو صورت رسولؐ کی

اب یہ کھلا کہ تم تھے آدم کے آئینے میں
جیسے رخ قمر میں خورشید جلوہ گر ہے

قلعہ معلیٰ میں جشن جمہوریت کا دوسرا مشاعرہ تھا۔ گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حضرت واصفؔ دہلوی باوجود مدعو ہونے کے سامعین میں تشریف رکھتے تھے۔ کسی شاعر سے مشاعرہ اکھڑ گیا۔ سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ آخرکار امنؔ صاحب نے اعلان کیا کہ اگر مولانا واصفؔ دہلوی میری آواز سن رہے ہوں تو مائک پر تشریف لائیں اور غزل سے نوازیں۔ مولانا تشریف لے گئے، دو تین منٹ تک سامعین پر نظر ڈالتے رہے۔ مجمع خاموش ہو چکا تھا۔ پھر شاندار ترنم اور زوردار آواز میں مندرجہ ذیل غزلیں پڑھیں۔ مشاعرہ قابو میں تھا اور ہر شخص غور سے ایک ایک شعر سنتا اور داد دیتا تھا۔

غزل

چن لیا قدرت نے تجھ کو آزمانے کے لئے
حوصلہ پیدا کر اے دل غم اٹھانے کے لئے
قتل کی دیتے ہو دھمکی آزمانے کے لئے
کچھ سلیقہ چاہئے میرے ستانے کے لئے
گریۂ شبنم ہے غنچوں کے تبسم کی دلیل
اشک پیدا کر چمن میں مسکرانے کے لئے
ہم نشیں ہم بیکسوں کی بے نوائی کو نہ دیکھ
آسماں کافی ہے ہم کو سر چھپانے کے لئے
دم بخود نیچی نگاہیں پیکر تسلیم ہوں
مجھ سے بہتر کون ہوگا آزمانے کے لئے
ہے یقیں دل میں تو کچھ اندیشہ طوفاں نہیں
موج اٹھ کر آئے گی تجھ کو بچانے کے لئے
کس قدر مشکل ہے دنیا میں مسرت کا حصول
کتنے ساماں ہوتے ہیں گل کو ہنسانے کیلئے
بھول جا اے ہم نشیں افسانۂ نجد و یمن
اب تو ہم ہیں باعث عبرت زمانے کیلئے
ہم جگانے آئے تھے اور خود ہی آ کر سو گئے
اب ہمیں کون آئے گا واصفؔ جگانے کیلئے

غزل

مرا پروانۂ دل اپنی منزل یاد رکھتا ہے
کہ جلتا ہے مگر آداب محفل یاد رکھتا ہے
ستارے یہ ستارے کیا کرینگے رہبری میری
مرا ہر اک قدم خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے
نکالا تھا بڑی ذلت سے جسکو تو نے محفل سے
وہ جنت میں بھی جا کر تیری محفل یاد رکھتا ہے
بہت نازک سی حد ہے بیخودی میں اور مستی میں
وہی ہے باخبر جو حد فاصل یاد رکھتا ہے

مٹا کر اپنی ہستی رخ بدل دیتا ہے طوفاں کا　　بگڑنے پر بھی قوت اپنی ساحل یاد رکھتا ہے
خدا کا واسطہ دونگا اسے میں نے یہ سوچا تھا　　مگر اب تو خدا کو بھی وہ قاتل یاد رکھتا ہے

تلاش عزت و شہرت میں کیوں آوارہ ہے واصفؔ
وہی انساں ہے جو خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

حضرت مفتی صاحب کے وصال کے بعد مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داریوں اور مفتی صاحب کے فتاوی کی جمع آوری اور دیگر علمی و ادبی مصروفیات کے سبب مولانا نے مشاعروں کی شرکت ختم کردی۔ میں نے ان کو کسی ادبی تقریب میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے صرف دو تین دفعہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ جب خواجہ محمد شفیع دہلوی پاکستان سے دہلی آئے تو وہ مولانا سے ملاقات کرنے ہمارے گھر تشریف لائے تھے اور ان کے اعزاز میں ہونے والی دو تین تقریبوں میں مولانا نے بھی شرکت کی تھی۔ ایک تو دریا گنج میں غالباً امن لکھنوی کے مکان پر جناب گلزارؔ دہلوی نے منعقد کی تھی اور ایک غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد کی گئی تھی۔ ان دو تقریبوں میں مولانا واصفؔ صاحب نے شرکت فرمائی تھی۔ اور ایک مرتبہ ساحرؔ دہلوی کے مکان واقع سڑک پریم نرائن پر انجمن تعمیر اردو دہلی کی برپا کردہ ایک ادبی محفل میں شرکت کی اور مقالہ پڑھا تھا۔ مقالہ کا عنوان تھا ''اردو کی بپتا''۔

اس گوشہ نشینی کا ذکر طالبؔ دہلوی نے ''یہ تھی دلّی'' میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا واصفؔ دہلوی ایک سو ایک فیصد خانہ نشین ہیں۔ کہیں آتے جاتے نہیں، کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ مشاعروں میں نظر آتے نہیں...''

یہاں پنڈت رتن موہن ناتھ زتشی خارؔ دہلوی کا ایک خط جو انھوں نے ۱۹۷۷ء میں مولانا کو لکھا تھا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:

> ''برادرم واصفؔ صاحب تسلیم و نیاز!
>
> پرسوں شام کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں حفیظؔ جالندھری جو پاکستان سے تشریف لائے ہوئے ہیں انکا استقبال تھا میں بھی شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہاں واجد سحری سے ایک نسخہ ''زرگل'' کا موصول ہوا۔ شکریہ۔ آپ نے مجھ گوشہ نشین کو یاد رکھا اس کا ممنون ہوں۔ میاں آپ قابل مبارکباد

ہیں کہ آپ نے اپنا مجموعہ کلام چھپوا ڈالا۔ ہم تو ابتک ڈھل مل یقین ہی ہیں۔ کہیں کہیں سے کلام پر نظر ڈالی تو قابل تحسین ہی پایا اور کیوں نہ ہو۔ میں خود کم آمیز واقع ہوا ہوں لہٰذا کسی سے نہ ملنے کی شکایت نہیں کر سکتا۔ تاہم کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تو ملنا ہی چاہیے۔ آپ کو شاید علم ہو کہ طالبؔ مرحوم کی یاد میں ایک بزم کی تشکیل کی گئی تھی۔ اسکی نشست ہر مہینہ کے آخری اتوار کو طالب مرحوم کے مکان واقع گلی بتاشان بڑ شاہ بولا پر شام کو ۵ بجے کے قریب ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی شرکت کی زحمت فرمائیں گے۔ آپ سے قریب ہے اس لئے کوئی دشواری بھی نہیں ہوگی۔ اس ماہ طرحی مشاعرہ ہے مگر آپ کے لئے کوئی قید نہیں، طبیعت حاضر ہو کچھ شعر طرح میں کہہ لیں تو سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔ مصرع طرح ''شیشے کی طرح ٹوٹ کے ہستی بکھر نہ جائے'' بہر حال مجھے قوی امید ہے کہ چاہے طرح میں غزل ہو یا نہ ہو آپ سے وہاں ملاقات ضرور ہوگی۔

والسلام نیاز کیش خارؔ دہلوی''

اب مولانا کا جواب بھی ملاحظہ ہو:

''محترم بھائی۔ آداب وتسلیم۔

آپ کا خط ملا، غنچۂ دل کھلا۔ آپکی عزت افزائی اور تحسین کا شکریہ، لیکن ہے یہ سب کچھ بزرگوں کی توجہات کا عطیہ۔ کثرتِ مشاغل اور ہجوم افکار کی وجہ سے تمام تفریحات کو چھوڑنا پڑا اور اہل زمانہ سے مونھ موڑنا پڑا۔ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اپنے ذہن کو کچھ تحریری کاموں میں الجھائے رکھتا ہوں تا کہ مکروہات زمانہ کا بار کچھ زیادہ محسوس نہ ہو اور اپنی بدنصیبی کا زیادہ افسوس نہو۔ لیکن آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ہمارے آپ کے قلبی تعلق میں کوئی کمی اور برادرانہ مراسم میں کوئی برہمی واقع ہوگئی۔ بھائی کئی برس سے افسردگیٔ خاطر کی بنا پر فکر سخن ملتوی اور خصوصاً بساطِ تغزل تو بالکل منطوی ہے۔ ادبی محفلوں کی عدم شرکت اور عقم طبیعت دونوں ایک دوسرے کا نتیجہ اور سبب۔ آگے حد ادب۔

آپ کا بھائی۔ واصفؔ 24/4/77"

آزادی کے بعد اردو کے کسی متعصب شاعر نے اردو شاعروں پر یہ اعتراض کیا کہ اب یہ کیا ہو گیا کہ شاعری میں اپنی بپتا اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے اثرات اور مار کاٹ کا ہی تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ تو اس پر مولانا واصفؔ دہلوی نے ایک طویل نظم لکھی "ایک نکتہ چیں اور شاعر" اس کے دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں۔ پوری نظم انتخاب کلام میں ملاحظہ فرمائیں:

مسلم و ہندو سے بالا تر ہے شاعر کی نظر
دیکھ کر دنیا کو دکھ جاتا ہے شاعر کا جگر
اپنے گرد و پیش سے دل کو بچا سکتا نہیں
اپنے احساسات کو شاعر چھپا سکتا نہیں

خصوصیات شعر:

مولانا کے مزاج کو دنیاوی علائق وصفات سے کوئی وابستگی نہیں تھی۔ وہ اپنے حفظ نفس، اپنی وضع داری اور گرانقدر اقدار و روایات کے پابند تھے۔ شاہ غزل میرؔ کے مانند وہ تمام عمر غموں اور اپنے سوز و گدازِ پنہاں کو لباس شعر پہناتے رہے اور ادبی جواہر پارے عالم وجود میں آتے رہے۔

غم ستاتا ہے تو کرلیتا ہوں میں فکر سخن
کچھ نہیں واصفؔ تو دم بھر کو بہل جاتا ہے دل

مولانا کے شعر میں عشق کی تپش بھی ہے اور زندگی کی ناگزیر تلخ کامیاں بھی اور انسان کے ساتھ دردمندی کا اظہار بھی۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کی تلخیوں اور سختیوں کو غزل کے قالب میں ڈھال کر ہم تک پہونچایا ہے۔ وہ مکتب داغؔ کے نمائندہ شاعر ہیں ان کو محاورہ، زبان اور اس کے در و بست اور فصاحت و بلاغت پر کمال قدرت حاصل تھی۔ ان کے شعر میں معیاری کلاسیکی شاعری میں پائی جانے والی بندش کی چستی، دلکشی، صوتی آہنگ اور روانی ہے۔ ہو سکتا ہے ان کی شاعری کا ابتدائی محرک عشق ہو لیکن غم و سوز اور پیہم صدمات

کی آگ نے ان کے فن کو خوب نکھارا۔

کاش اک دن بزم میں تم میری آ کر بیٹھتے   اور نقابِ عارضِ تاباں اٹھا کر بیٹھتے
آسمانِ پیر کی نظروں سے بچنے کے لئے   بانوئے مہتاب کے آنچل میں جا کر بیٹھتے
کب ملے گا چھٹکارا اضطراب پیہم سے   جستجوئے راحت میں عمر بھی گریزاں ہے
زیست کو پر کیف کرنے کا قرینہ آ گیا   موت سے آنکھیں ملا کر ہم کو جینا آ گیا

ان کی عشقیہ شاعری میں رجائیت، آرزو مندی، حسرت وصال اور یادوں کا پہلو غالب ہے مگر قنوطیت نہیں ہے۔ ''آرزوئے موہوم'' اور ''ایک حسرت'' وغیرہ نظمیں اس کی غماز ہیں۔ 'ایک حسرت' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

یاد ہے مجھ کو تری طلعت موزوں کا نکھار   ہائے وہ شوخ ادائیں وہ جوانی وہ ابھار
آنکھ وہ آنکھ فرشتوں کو کرے جو بیمار   چال وہ چال قدم اٹھتے ہی آ جائے بہار
تھی تمنا تری تعریف سناؤں تجھ کو
تری ہنستی ہوئی تصویر دکھاؤں تجھ کو

حضرت واصفؔ دہلوی کی شاعری میں مضامین رنگا رنگ اور مضامین کہنہ نئے انداز میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ شاعری کا فنی تجزیہ، زبان و بیان کی خوبیاں، تخیلی بلند پروازی، شوکت الفاظ وغیرہ خصوصیات پر تو ماہرین فن قلم اٹھائیں گے میں ان کی شاعری کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں:

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

مولانا حضرت سائلؔ کے واسطے سے داغؔ اسکول سے وابستہ ہیں اور اس دبستان کے ممتاز شاعر ہیں لیکن ان کے ہاں صرف زبان اور محاورہ کی شاعری نہیں ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کہتے ہیں:

> ''وہ سراج الدین احمد خاں سائلؔ جانشین داغؔ کو اپنی غزلیں دکھاتے اور ان پر اصلاح لیتے تھے اور اس معنی میں دبستان داغؔ سے وابستہ تھے۔ لیکن اس دبستان کی فکر سے اس کی فنی روشوں سے وہ کچھ الگ تھلگ نظر آتے ہیں... ان

کا مجموعہ کلام ''زرگل'' اپنی موجودہ صورت میں ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحات کی سیر سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی شاعری کا آغاز موجودہ (بیسویں) صدی عیسوی کے ربع اول میں ہو چکا تھا جس کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے شعر وسخن کی طرف مائل تھے۔ لیکن اس فن کو انھوں نے نہ شاعرانہ انداز سے اختیار کیا نہ شعری پیشکش کے کچھ ایسے لوازم کا خیال رکھا جو مجموعوں کے انتخاب کے وقت اگر سامنے رہیں تو نتائج خود شاعر کے حق میں زیادہ بہتر ہو سکتے ہیں۔ مولانا وقتاً فوقتاً جو کچھ لکھتے رہے اس کو اس میں جمع کر دیا انتخاب کی نوبت شاید نہیں آئی اور غالباً اس لئے نہیں آئی کہ مولانا اسکے ذریعے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ بہ اعتبار شاعر ان کا ادبی سفر کس طرح طے ہوا۔ اور ان کے شعر وشعور میں کیا کیا موڑ آئے۔ انھوں نے کس وقت کس طرح سوچا اور کس انداز سے کہا۔''

تنویر صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''عام طور پر یہ سوچ لیا گیا ہے کہ دہلی کی ٹکسالی زبان علمی اور ادبی زبان سے الگ ہے۔ لیکن جب بڑے ادیب، بڑے شاعر، یا پھر بڑے صاحب علم دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں شعر کہیں گے تو اس کا رنگ صرف جامع مسجد کی سیڑھیوں کا نہیں ہو سکتا۔ عوامی بولی ٹھولی، روزمرہ اور محاورے سے الگ ہو کر شعر کہنا ایک الگ بات ہے اور محض محاورے اور روزمرہ کیلئے شعر کہنا ایک دوسری صورت ہے۔ مولانا کے یہاں ہمیں پہلی ہی شکل ملتی ہے۔''

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''... داغؔ اسکول کے ایک ممتاز شاعر مولانا حفیظ الرحمانؒ واصفؔ بھی تھے مولانا واصفؔ دہلوی کی انفرادیت کئی اعتبار سے مسلم ہے۔ مفتی کفایت اللہ کے فرزند تھے اور نواب سراج الدین سائلؔ کے فرزند معنوی تھے۔ حضرت سائلؔ کو تلامذہ داغؔ میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ ان دو مختلف دھاروں نے مولانا واصفؔ کی شخصیت میں نکھار پیدا کر دیا۔ علم وفضل خاندانی ورثہ میں ملا۔

یہی سبب ہے کہ عربی ، فارسی ، اردو کے علاوہ لسانیات ، عروض اور قواعد پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔۔۔۔۔۔‘‘

(برہان دہلی اپریل ۱۹۸۹ئ)

پروفیسر قمر رئیس کے الفاظ میں:

’’داغ اسکول کے شعراء کے کلام میں روایتی مضامین یا پھر زبان اور محاورے کے اشعار کی کثرت بالعموم آج کے پڑھنے والوں کو متاثر نہیں کرتی۔ اگر جدت خیال نہ ہو تو کم از کم جذبہ اور احساس کی گرمی یا تازگی تو ہو۔ مولانا واصف کی غزلوں میں مجھے ایسی ہی گرمی، تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوا۔ اشعار میں تنوع بھی ہے اور تاثیر بھی۔‘‘

ڈاکٹر تنویر علوی صاحب مولانا کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’ان کے یہاں دہلوی زبان کا ایک خاص رچا بسا انداز تھا اور ہونا بھی چاہئے... وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے قریب رہتے تھے۔ زبان کی نوک پلک سے واقف تھے۔ محاورہ بحت کو جانتے تھے اور روزمرہ کے نکتہ شناس تھے لیکن اپنے علمی مزاج اور عربی فارسی سے گہری واقفیت کی وجہ سے کبھی بھی ایسا شاید نہیں ہوا کہ انھوں نے شاعرانہ فکر فرمائی کے وقت صرف محاورے اور روزمرہ کو سامنے رکھا ہو۔ اور بقول میرؔ یہ خیال کیا ہو کہ میرے کلام کے لئے محاورہ اہل دہلی ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں۔‘‘

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مولانا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’قبلہ دیدہ و دل! آپ کا مجموعہ ’’زرگل‘‘ موصول ہوا۔ بے حد ممنون و مسرور فرمایا۔ آپ کے یہاں جو زبان و بیان کی خوبیاں ہیں، جو فکری تہ داری اور نزاکتِ احساس ہے وہ مجھے اس زمانے میں کسی جگہ نہیں ملتا اس لئے میں نے شعری مجموعے پڑھنے چھوڑ دیے ہیں۔ لیکن آپ کا مجموعہ زرگل میں نے شروع سے لے کر آخر تک پڑھا اور بے حد محظوظ ہوا۔ آپ نے غزل کو نئی رفعت بخشی ہے اور داغ کے نام کو زندہ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست رکھے اور آپ کا سایہ ہمارے اوپر تا دیر قائم رکھے۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

ارادت مند۔ خواجہ احمد فاروقی“

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی تحریر کرتے ہیں:

”مولانا واصفؔ کے یہاں وہ شوخی اور زبان و بیان کا چٹخارہ نہیں ہے جو داغؔ کی شاعری کا طغرائے امتیاز رہا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان چٹخاروں کے لیے جن عشقیہ موضوعات کی ضرورت ہوتی ہے ان کے درمیان مولانا کے اعلیٰ مذہبی خاندان کا وقار حائل ہو... ان کے مجموعۂ کلام ”زرگل“ میں جو عشقیہ نظمیں ہیں ان میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کوئی جذبہ ہے جو اس کو روک دیتا ہے... ہر صنف سخن میں ان کی قادر الکلامی کی چھاپ نظر آئیگی۔“

مولانا انتہائی متانت و وقار کے ساتھ واردات دل اور اپنے جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے الفاظ میں:

”مولانا واصفؔ کی غزلوں میں تغزل کی نشاندہی بخوبی کی جاسکتی ہے عشقیہ جذبات اور واردات کا اظہار انھوں نے بڑی خوبی کیساتھ کیا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دیدار سے پہلے ہی کیا حال ہوا دل کا
کیا ہوگا جو اٹھیں گے وہ رخ سے نقاب آخر
ان کو جی بھر کے نہ دیکھا کہ ہوئی صبح فراق
اس قدر تیز کبھی وقت کی رفتار نہ تھی
اے کاش ٹھٹک جائے ذرا ناقہ لیلیٰ
دیوانے کو بس وقفہ یک گام بہت ہے
محفل شب میں کسکو تھا مجھ پہ گمان عاشقی
تیری نگاہ کی حیا تہمت عشق دھر گئی

یہ طوفانِ حوادث یہ تلاطم باد و باراں کا
محبت کے سہارے کشتی دل ہے رواں ابتک

اتنا نظر سے اپنی گراؤ نہ مجھ کو تم
کیا کیا رہا ہے تم سے مرے دل کو ارتباط

پیتے ہیں ہم تو اشک بڑے اہتمام سے
دل کا معاملہ ہے کہاں تک ہو احتیاط

زیارت کو وہ دشت نجد کا جانباز آئے گا
ذرا دم بھر کو میری نعش ویرانے میں رکھ دینا

ان اشعار سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مولانا واصفؔ کے یہاں ایک ٹھیراؤ اور آہستہ روی ہے۔ وہ معاملات حسن وعشق کو بھی جذباتیت کے دھارے میں ڈالنے کے قائل نہیں۔ جب ضبط نہیں ہوتا تو صرف اس قدر کہہ کر خاموش ہوجاتے ہیں کہ: دل کا معاملہ ہے کہاں تک ہو احتیاط''

مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ کے بقول:

''واصفؔ صاحب ان مسکین صفت درویشوں میں سے تھے جنکا معاملہ اللہ کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ وہ صوفیت کی ظاہر داریوں کے خلاف تھے مگر صوفی تھے۔ تصوف کی جان استغناء وخودداری ہے۔''

مولانا کی شاعری میں تصوف کے اشعار بھی ہیں لیکن ان کا نظریہ عام روش سے کچھ مختلف ہے مثلاً ان کا یہ شعر:

منافی تھا یہ اے منصور دستور امانت کے
کسی کی بات کو یوں اپنے بیگانے میں رکھدینا

مولانا واصفؔ دہلوی کی شاعری کے اس پہلو پر ظہیر صاحب نے لکھا:

''اول تو غزل کا مزاج صوفیانہ بھی ہے اور پھر مولانا واصفؔ جن کے ساتھ ایک علمی اور مذہبی روایت ہے وہ تصوف سے کیسے گریز کر سکتے تھے۔ مولانا کے صوفیانہ نظریات کی بنیادی خصوصیات میں تصوف کے سیدھے سادے مسائل

ہیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے انھوں نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ وہ 'جنون عشق' کو عشق حقیقی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اس راہ میں دیر وحرم کی 'پابستگی رسم ورہ' کو بھی نظرانداز کردیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے:

فتنے بہت ہیں بت کدہ و خانقاہ میں
اچھے رہے جو دشت جنوں میں پڑے رہے

چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے شاعر کے مسلک کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

مری کامیاب نگاہ بھی مرے شوق کو نہ پہونچ سکی
مری روح محو جمال تھی جو نظر گئی رخ یار پر
خدا جانے کہ اب اہل نظر کا حال کیا ہوگا
تمنا جس کی تھی وہ لمحہ دیدار آپہونچا''

پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کہتے ہیں:

''مولانا واصفؔ دہلوی شعر وسخن میں ابوالمعظم نواب مرزا سراج الدین احمد خان سائلؔ دہلوی کے شاگرد رشید بلکہ جانشین تھے۔ عربی فارسی کے منتہی تھے۔ صرف ونحو، زبان و ادب، عروض و قواعد، معایب و محاسن سخن، روزمرہ، محاورات، اور ٹکسالی اردو اور دہلوی بولی پر قادر تھے۔ آپ شستہ مذاق سخن، نازک خیالی، لطافت ادا، ذوق جمالیات کے حامل تھے اپنے استاد نواب سائلؔ سے زبان کی شوخی اور چونچلے اور فن شاعری کا بھرپور اکتساب کیا۔ آپ کی عربی دانی اور دینی شغف کبھی آپ کی شاعری میں زہد خشک اور کٹر ملاپن بن کر داخل نہیں ہوا۔ آپ اس معاملے میں وسیع المشرب، روشن دماغ، کشادہ ذہن، روادار اور وسیع القلب واقع ہوئے تھے۔''

حضرت مولانا منظور نعمانیؒ سے مولانا واصفؔ صاحبؒ کے مراسم قدیم تھے۔ مولانا نعمانی ان کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ مولانا نعمانیؒ نے راقم کو لکھا تھا کہ:

''مولانا (واصفؔ صاحب) مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے مختلف النوع کمالات سے نوازا تھا لیکن انھوں نے زمانہ کی عام روش کے خلاف اپنے کسی کمال کی

شہرت کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی کوشش غالباً یہی رہی کہ ان کے کمالات کی شہرت نہ ہو۔’’

ظہیر صاحب کہتے ہیں:

‘‘ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے اپنے علوم وفنون کی خود حدیں مقرر کر دی ہیں۔ انھوں نے عشقیہ تقاضوں اور اخلاقی معیاروں میں ایک مفاہمت پیدا کر لی ہے۔ ان متضاد کیفیتوں میں آپس میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ان کی ادبی حیثیت، شاعرانہ مرتبہ، اور مذہبی تقدس ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف بن کر سامنے آتے ہیں۔’’

کلام واصفؔ میں مزاح بھی ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی صاحب کے بقول:

‘‘انکے یہاں مزاحیہ کلام بھی ہے لیکن یہ مزاح زیادہ تر روایتی عناصر کے عمومی تاثر کا نتیجہ ہے۔ وہ خود خوش مذاقی سے زیادہ مذاق کے قائل نہ تھے۔’’

اس ضمن میں ایک نظم ‘‘ایک بڑھیا کا عشق ایک نوجوان سے’’ پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

لگائی ہے مہندی سنواری ہے چوٹی　　بہت تیل پانی کا مانجھا کیا ہے
یہ سرخی یہ پوڈر یہ مانگ اور پٹی　　ترے واسطے میں نے سب کچھ کیا ہے
نہ ہے دانت مونھ میں نہ ہے پیٹ میں آنت　　ترے عشق نے مجھ کو اندھا کیا ہے
اندھیرے میں کیوں ہاتھ تجھ پر نہ پھیروں　　مری اجڑی کٹیا کا تو ہی دیا ہے
کھلاؤں گی گودی میں میں تجھ کو بالم　　تو آنکھوں کا تارا ہے من کی ضیا ہے

دوست احباب وتلامذہ:

اب کوئی ایسی ہستی باقی نہیں رہی جو مولانا کے ساتھ بے تکلفانہ راہ ورسم رکھنے کی وجہ سے ان کی ابتدائی زندگی کے حالات پر کچھ روشنی ڈال سکے۔ ان کے بچپن اور لڑکپن کے زمانے کے دوست پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ ان دوستوں کا تذکرہ مولانا نے خود ‘‘زرگل’’ میں کیا ہے۔ محمد میاں جاذب قریشی دہلوی (کراچی میں تھے لیفٹیننٹ میجر کے

عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے بعد میں تخلص جاذب آفاقی کر لیا تھا)، (میجر) سید ابن حسن شارق دہلوی اور ماسٹر امیر الدین عامرؔ۔ ان تینوں حضرات سے مولانا کی مراسلت آخر تک رہی۔ محمود مرزا کاشفؔ دہلوی بھی انھیں ہم جولیوں میں سے تھے۔ یہ بھی نقل وطن کر گئے تھے۔ ان سے بھی خط و کتابت آخر تک رہی۔ مخمورؔ دہلوی اور خارؔ دہلوی بھی قریبی دوست تھے۔ ایک بے تکلف دوست حکیم میرن تھے جو او کھلے میں رہتے تھے اور اکثر ملاقات کیلئے آتے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ ماہر غالبیات مالک رام سے بھی ابتدائی زمانے سے مراسم تھے۔ ڈاکٹر پریم لال شفا، کنہیالال آزردہؔ، فرقتؔ کاکوروی، شمیم کرہانی دوستوں میں تھے۔

شاگردوں میں سے چند اصحاب کے ناموں کا علم ہو سکا ہے۔ سلطان مرزا دہلوی، ابراہیم خلیل، مولانا محمد فاروق واصفی، زبیرؔ دہلوی، مولانا عبد الرحمن شاکرؔ، عبد العزیز ظفرؔ۔ ان میں مولانا فاروق صاحب بقید حیات ہیں۔

مولانا واصف دہلوی اور دہلی

مولانا واصف دہلوی کو دہلی سے عشق تھا۔ ان کی کتابوں میں جا بجا دہلی کا تذکرہ اسی عشقیہ والہانہ پن کے ساتھ ملتا ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دلّی کا دل ان کے سینے میں دھڑک رہا تھا اور قدیم دلّی کے تہذیب و تمدن کے چراغ ان کی آنکھوں میں روشن تھے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی فرماتے ہیں:

> ”بھلا ان کے علاوہ اور کس نے یہ بات کہی ہوگی کہ جب میں نے خدا کے سامنے زندگی کا پہلا سجدہ کیا تو دلّی کی خاک پاک میرے چہرے پر لگی تھی۔
>
> میری پیشانی جو سجدے میں گئی تھی پہلے
> ہے یہی خاک جو چہرے پہ لگی تھی پہلے
>
> خاک وطن کی اس نئی عظمت کی دریافت دراصل اس عرفان ہی کی دین تھی جو انھیں دہلی کی محبت نے عطا کیا تھا۔“

مولانا کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے جمیل مہدی لکھتے ہیں:

''گذشتہ مہینے (۱۳ر مارچ) کو اجڑنے اور بار بار بسنے والی دلّی کی ایک اور فخر روزگار شخصیت مولانا حفیظ الرحمان واصف کی شکل میں اس دنیا سے اٹھ گئی اور دلّی کی بساط علم ودین اور ادب وشعر پر چھایا ہوا اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا۔ وہ ان ٹمٹماتی ہوئی شمعوں میں سے ایک شمع تھے جو آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کی دہلی کی تمدنی تبدیلیوں اور لسانی اور سماجی تلاطم کی نوعیت اور کیفیتوں کی عکاس تھی۔ اور وہ خود آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے درمیان نہ صرف حد فاصل کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ ان کا شمار سماجی انقلاب جال کے مشہور ماتم گساروں اور میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، حالیؔ اور داغؔ جیسے نوحہ خوانوں میں ہوتا تھا۔''

(ماہنامہ برہان دہلی اپریل ۱۹۸۷ء)

ساحرؔ دہلوی کی یاد میں انجمن تعمیر اردو نے جو محفل بپا کی تھی اس میں شرکت کرنے اور مقالہ لکھنے کے لئے مولانا کو چچا گلزارؔ دہلوی نے منا لیا تھا۔ یہ بزم اگست ۱۹۸۳ء میں آراستہ کی گئی تھی۔ مقالہ کی ابتدا میں مولانا فرماتے ہیں:

''جو موضوع سامنے ہے وہ تو ایک مکمل اور دردناک مرثیہ ہے دلّی کا اور دلّی والوں کا، دلّی کی تہذیب واخلاق کا، دلّی کے آداب کا، دلّی کی زبان کا، دلّی کی آن بان کا، دلّی کی نظافت ولطافت کا، دلّی کی حمیت وشرافت کا۔''

مولانا نے متعدد نظموں میں دہلی کا ذکر کیا ہے کہیں قصیدہ ہے، کہیں مرثیہ خوانی کی ہے، کہیں تمنا کی ہے کہ دلّی اپنا وہ علمی مقام پھر حاصل کر لے۔ ''دہلی مرحوم''، ''قطب مینار''، ''جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا جشن سیمیں''، ''شاہجہان آباد اور انقلاب ۱۹۴۷ء''، ''ہائے میری دلّی'' وغیرہ نظموں میں دلّی ہی کا قصیدہ یا مرثیہ شامل ہے۔ ''دہلی مرحوم'' مسدس کی شکل میں چودہ بندوں کی طویل نظم ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

اے جہان آباد اے معمورۂ علم وحکم　　اے بہارستان ہند اے مرجع روم وعجم
خوابگاہ راحت شاہان اسکندر حشم　　پردہ گاہ حسن فطرت غیرت باغ ارم
آہ! کیا دن تھے کہ تو علم وادب کا مہد تھا
عافیت خوشحالی وعیش وطرب کا عہد تھا

یادگار سطوت غرناطہ و بابل ہے تو
بحر تہذیب وتمدن کے لئے ساحل ہے تو
دل اگر ہندوستاں ہے تو سواد دل ہے تو
روئے پرنور جہاں پر ایک زیبا تل ہے تو
تیری ہستی راز دار عظمت دیرینہ ہے
ہر ادا سے تیری ظاہر شوکت دیرینہ ہے

قطب مینار پر سیکڑوں نظمیں کہی گئی ہوں گی لیکن مولانا کا طائر خیال اس میں کیا دیکھتا ہے آپ بھی دیکھیں:

اے قطب مینار اے خمیازۂ دور شباب
اے نقیب حریت اے یادگار انقلاب
ارتقائے عشرت فانی کی معراج حسیں
کشور صنعت کا تو شہزادۂ گردوں طناب
شاہراہ زندگی کا ہے نشان رہ نما
یا کوئی سرکش فرشتہ آگیا زیر عتاب
یا ملائک کے اترنے کے لئے زینہ ہے تو
یا ہے چرخ بے ستوں کا اک ستون دیریاب
یا مسافر جو بچھڑ کر کارواں سے رہ گیا
کر رہی ہو جس سے کچھ سرگوشیاں حور سحاب
یا چلی آتی ہے اک امڈی ہوئی موج مہیب
یا مئے دوشیں سے کوئی دیوتا مست وخراب
تیری عظمت سے لجاتا ہے عروج ماہ تام
تیری ہیبت سے لرزتا ہے طلوع آفتاب

آزادی کے بعد برپا ہونے والے کشت وخون اور بربادی وخرابے کا شدید اثر مولانا کے دل ودماغ پر ہوا تھا۔ ’’شاہجہان آباد اور انقلاب ۱۹۴۷‘‘ کے دو شعر دیکھیں:

ہزار سالہ تمدن کی یادگار لٹی
کہو ظفرؔ سے کہ دلّی کی پھر بہار لٹی
پھر اپنے چاہنے والوں سے چھٹ گئی دلّی
صبا! یہ ذوقؔ سے کہنا کہ لٹ گئی دلّی

درج ذیل رباعیات بھی ملاحظہ ہوں:

دلّی میں مبارک ہو تمھارا آنا
اور تحفۂ اخلاص و مودت لانا
دلّی کے مشاعروں میں آنے والو
دلّی پہ فاتحہ بھی پڑھتے جانا

شکریۂ الطاف ادا کون کرے
مہمانوں سے کچھ شکوہ گلا کون کرے
اب اجملؔ و سائلؔ ہیں کہاں دلّی میں
سر معرکۂ مہر و وفا کون کرے

اب انجمن شعر و سخن کیا ہوگی　　اب خیر سے ترتیب چمن کیا ہوگی
اب ساحرؔ و سائلؔ ہیں کہاں دلّی میں　　اب عزت آداب کہن کیا ہوگی

(مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی۔ پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی شاگرد غالبؔ)

۱۴؍مارچ ۱۹۸۷ء کو علم و ادب، شعر و سخن کے اس خزانہ کو ہزاروں سوگواروں نے حضرت شاہ ولی اللہ کے قریب مہندیوں کے قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے چھپا دیا۔

قطعات تاریخ وفات

ڈاکٹر مغیث الدین فریدی ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے تاریخ وفات نکالی اور ایک قطعہ تاریخ وفات کہا:

مرقد پاک نہاد حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی

۱۹۸۷ء

مفتی اعظم[1] کے وارث، جانشیں سائل[2] کے تھے
چل دیئے کہہ کر کہانی دہلی مرحوم کی
بن[3] کے تاریخ ان کا ''وہ'' مصرع زباں پر آگیا
''مٹ گئی خاص اک نشانی دہلی مرحوم کی''

۱۱+۱۹۷۶=۱۹۸۷ء

---

[1] مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب

[2] نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی

[3] یہ مصرع واصفؔ صاحب مرحوم نے حضرت سائلؔ کی وفات پر کہا تھا۔ 'تذکرہ سائل' میں واصفؔ صاحب نے سائلؔ مرحوم کا جو مرثیہ شائع کیا ہے اس میں یہ مصرع موجود ہے۔ اتفاق سے واصفؔ صاحب کی تاریخ وفات ان کے ہی مصرع میں گیارہ (۱۱) عدد کے تعمیہ سے حاصل ہوتی ہے۔ میں اسے واصفؔ صاحب کا فیض باطن سمجھتا ہوں۔

(مغیث الدین فریدی ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی۔ ۲۲؍مارچ ۱۹۸۷ء)

قطعہ تاریخ وفات

مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی

از ڈاکٹر شان الحق حقی (کراچی)

مرگ بے ہنگام واصفؔ الامان و الحفیظ   یہ بھی اک صدمہ مقدر تھا جو دلّی سہہ گئی
ہم نے دیکھے ہیں جو نقشے اب نہ دیکھے گا کوئی   بند ہوتے ہوتے ان کی چشم بینا کہہ گئی
نوحۂ واصفؔ کہو یا نوحہ دلّی کہو   اشک کی اک بوند سی چشم قلم سے بہہ گئی
سر کو ٹکراتے تھے جس دیوار زنداں سے اسیر   آخرش دیوار وہ ان کے ہی سر پر ڈھ گئی
ہند کے اگلے سفر میں ان سے تھی ملنے کی آس
اہل ہند اب حسرت دیدار واصفؔ رہ گئی

۱۴۰۷ھ

(ہندوستان کے پچھلے دوروں میں ان سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ یہ تاریخ حسب حال ہے)

شان الحق حقی

”اے داغؔ کی دلّی کے رہنے والو! تمھاری یہ لطیف وشیریں زبان بننے کے لئے تو دس صدیوں کی ضرورت تھی لیکن بگڑنے بلکہ تہس نہس ہونے کے لئے صرف بیس برس کافی ہوگئے؟... آہ! تم کو کیا ہوگیا ہے؟ میں تم کو جگاتا ہوں تم نہیں جاگتے، تم کو جھنجھوڑتا ہوں تم کروٹ بھی نہیں لیتے۔“

(اردو کی بپتا از مولانا واصفؔ دہلوی کتاب نما دہلی ستمبر ۱۹۸۴ء)

◆◆◆

رحلت جامع العلوم

از ڈاکٹر محمد قاسمؔ دہلوی

کس کو ابا جان کہہ کر میں سناؤں دل کی بات
کون الجھن میں دکھائے گا مجھے راہ نجات
مضطرب کرتی تھی ہائے انکو بے چینی مری
انکی نیندوں کو اڑا دیتی تھی بیماری مری
کون اب میرے لئے عرفاں کی مشعل لائیگا
کون سیدھا راستہ مجھ کو دکھانے آئے گا
کون ہر اک گام پر مجھ پر نظر فرمائے گا
کون اب مجھ کو رموزِ زندگی سمجھائے گا
اک بیابانِ الم ہے اور مسافر ناتواں
اٹھ گیا سر سے وہ سایہ تھا جو مجھ پر مہرباں
کون دلّی کی زباں ہم کو سکھانے آئے گا
کون وہ بھولے ہوئے قصے سنانے آئے گا
ساتھ ان کے سائلؔ مرحوم کی دلّی گئی
وہ فصاحت وہ مروت وہ شرافت بھی گئی
آج اردو شعر اک استاد سے محروم ہے
دہلیٔ مرحوم کی ساری فضا مغموم ہے
وہ جگر گوشہ فقیہ عالی امت کے تھے
اور نشانی ذی وقارِ مفتیٔ ملت کے تھے
ساتھ ان کے مفتی اعظمؒ کی غیرت بھی گئی
آبروئے علم و دانش اور حکمت بھی گئی
دین کے جتنے خزانے مل سکے سب لے لیے
جاہ و شہرت چھوڑ دی تھی اہل دنیا کے لئے
قلعہ شاہِ جہان آباد بھی سنجیدہ ہے
جامع شاہ جہاں بھی آج کچھ رنجیدہ ہے
آج اپنے باغ سے ہے باغباں روٹھا ہوا
تیز طوفاں میں ہے کشتی بادباں ٹوٹا ہوا
خاکِ درگاہِ ولی اللہ دفینہ علم کا
اب وہیں خوابیدہ ہے قاسمؔ خزینہ علم کا

علمی وادبی آثار:

کفایت المفتی (نو جلدیں)، اردو مصدر نامہ، تذکرہ سائل، ادبی بھول بھلیاں، زرگل (مجموعہ کلام)، مفتی اعظم کی یاد، قرآنی پند نامہ، مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ، جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ، مطلقہ کی شرعی حیثیت، عقیدہ اور رواداری، قصہ بلی کا (یہ عبید زاکانی کی ایک فارسی نظم کا اردو نظم میں ترجمہ ہے) روض الریاحین (مفتی اعظمؒ کا شعری کلام)، رشحات قلم (مفتی اعظمؒ کے مضامین کا مجموعہ)۔ آخر الذکر دونوں کتابیں ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

کفایت المفتی:

بچپن کے کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ذہن سے محو نہیں ہوتے۔ انھیں میں سے ایک واقعہ مجھے بھی یاد ہے۔ رات کے دو ڈھائی بجے کا وقت، کسی ضرورت سے میں اٹھا ہوں شاید پانی پینے کیلئے، امی کو اٹھایا ہے۔ ابا جان کے کمرے میں ٹیبل لیمپ روشن ہے اور وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح وہ وقت بھی مجھے یاد ہے کہ ابا جان مدرسہ سے واپس آئے ہیں، شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکائی ہے۔ شدید گرمی کا زمانہ، تھوڑی دیر پنکھے کے نیچے بیٹھ کر پسینہ خشک کیا، غسل فرمایا، چائے پی، پان کھایا اور لکھنے بیٹھ گئے۔ یہ حضرت مفتی اعظمؒ کے فتاویٰ کی تسوید و تبویب فرما رہے تھے جو دنیا کے کونے کونے سے مدت دراز میں صرف کثیر کے بعد جمع کیے تھے۔ اور اب یہ کام تکمیل کے مراحل میں تھا۔ اس طرح خلوص نیت، تندہی، ایثار، محنت و جانفشانی کے ساتھ فقہ احناف کا ایک انمول خزانہ ترتیب دے کر متلاشیانِ حق کے استفادہ کے لئے محفوظ فرمادیا۔

حضرت مفتی اعظم کی زندگی میں مولانا واصف صاحب نے مفتی صاحب کی سوانح عمری مرتب کرنے کا کام شروع کیا تھا لیکن اسی دوران ۱۹۵۲ء میں مفتی صاحب کی رحلت ہوگئی۔ اور مدرسہ کی تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریاں آپ کے کندھوں پر آگئیں۔ اس لئے یہ اہم کام پایۂ تکمیل تک نہ پہونچ سکا۔ اور چونکہ جمع فتاویٰ زیادہ اہم اور دینی و علمی کام تھا اس لئے آپ نے اس کو ترجیح دی اور پہلے اس کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مولانا ''کفایت

المفتی"، جلد اول طبع دوم میں صفحہ ۱۳ پر رقمطراز ہیں:

> "ارادہ تھا کہ فتاویٰ کی جمع وتبویب کا کام سوانح کی تکمیل کے بعد شروع کیا جائے گا لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ بڑے غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ چوں کہ سوانح بالکل نامکمل حالت میں ہے اگر اس کو جاری رکھا جائے تو طویل مدت درکار ہوگی اور اس سے زیادہ اہم کام یعنی جمع وتبویب فتاویٰ میں بہت زیادہ تاخیر ہوجائے گی۔"

یوں تقریباً تین ہزار دوسو (۳۲۰۰) صفحات کا مسودہ مکمل ہوا۔ اس کے بعد کتابت کا مرحلہ شروع ہوا۔ کتابت شدہ کاپیوں کی خود مولانا اپنی اہلیہ (مولانا امین الدینؒ بانی مدرسہ امینیہ کی نواسی اور مولانا سید جلال الدین کی بیٹی) کے ساتھ مل کر تصحیح فرماتے۔ آپ کتابت شدہ کاپیاں بلند آواز سے پڑھتے اور میری والدہ مسودے سے مقابلہ کرتی جاتیں۔ غلطی کی نشاندہی کرتیں اور مولانا علیہ الرحمۃ کاپی میں نشان لگاتے جاتے۔ کتاب میں حضرت نے اس کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ طباعت کے دوران پروف ریڈنگ بھی اسی طریقہ سے فرماتے تھے۔

کفایت المفتی جلد اول پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر شائع ہوئی۔ ۱۹۷۵ء تک آٹھ جلدیں منظر عام پر آچکی تھیں۔ نویں جلد کی طباعت میں پریس کی طرف سے کچھ دیر ہو رہی تھی۔ ایک عید کے دن فرمانے لگے:

> "ہماری عید تو اس دن ہوگی جب کفایت المفتی مکمل نو جلد چھپ کر آجائے گی۔"

مولانا واصفؔ دہلوی کی پہلی کتاب "درس الاسلام" یعنی منظوم تعلیم الاسلام ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور کفایت المفتی کی جمع وتبویب اور اشاعت کے دوران متعدد علمی ادبی تاریخی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

فتاویٰ کی جمع وتبویب کا یہ مہتم بالشان کام تنہا ایک فرد کے بس کا نہ تھا بلکہ ایسے کاموں کے لئے علماء کے بورڈ اور بڑے بڑے بجٹ والے ادارے قائم کیے جاتے ہیں تب کہیں جا کر کچھ کارگزاری سامنے آتی ہے۔ لیکن سچی لگن اور خلوص نیت کی قوت کے ذریعہ یہ عظیم الشان کارنامہ فرد واحد کے ہاتھوں کن اذیت ناک حالات میں توفیق ایزدی سے انجام پایا کہ حریف انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہ کام توکل علی اللہ پر شروع ہوا اور

استعانت من اللہ پر مکمل ہوا۔ اور اس راہ میں کن کن مشکلات کا سامنا ہوا اور کیا کیا روڑے اٹکانے کی کوشش کی گئی اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے جو آپ نے دیباچہ کے شروع میں تحریر فرمایا ہے:

جہاں جہاں نظر آئیں تمھیں لہو کے چراغ مسافرانِ محبت! ہمیں دعا دینا

ابتداء میں مولانا کا خیال تھا کہ یہ کام مدرسہ کی طرف سے ہو۔ ایک صاحب کو مشاہرہ پر رکھا بھی گیا۔ لیکن جب کام خاطر خواہ نہ ہوا اور وقت ضائع ہوتا رہا تو حضرت نے اس کو تنہا اپنے ذمہ لے لیا اور بعون الٰہی تکمیل تک پہونچایا۔ مدرسہ نے جو الاؤنس مشاہرہ وغیرہ اس مد میں خرچ کیا تھا وہ ساری رقم مدرسہ کو واپس کر دی۔ اس کے بعد مجموعہ فتاویٰ کو خود ہی شائع فرمایا۔

اس کارنامہ کی شکل میں جہاں مولانا واصفؔ دہلوی علیہ الرحمہ نے ملت اسلامیہ کے فقہی خزانہ میں اہم اضافہ کو محفوظ کیا وہیں حضرت مفتی اعظمؒ کے وارث و جانشین ہونے کا حق بھی ادا کر دیا۔ خدائے عز و جل ان کی اس دینی خدمت کو قبول فرمائے اور مولانا مرحوم کے لئے موجب رحمت اور باعث رفع درجات بنائے۔ آمین!

مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

> ”کفایت المفتی کی ترتیب بہترین انداز کی فقہی ترتیب ہے۔ مولانا واصفؔ صاحب نے اس میں بہت محنت کی ہے۔ پچاس سالہ فتاویٰ کی ترتیب بڑا اہم کارنامہ ہے... حضرت مولانا واصفؔ علیہ الرحمہ نے اگر یہ محنت نہ کی ہوتی تو علماء و عوام حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ سے محروم رہتے۔“

ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند) کے اپریل ۱۹۸۷ء کے شمارے میں لکھا ہے:

> ”مولانا حفیظ الرحمان صاحب علوم دینیہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو ادب میں مولانا کی ذات ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ جو مختلف رسائل و اخبارات اور رجسٹروں میں منتشر تھے واصفؔ صاحب نے ان تمام فتاویٰ کو نہایت سلیقہ سے مدون و مرتب فرما کر کفایت المفتی کے نام سے عرصہ ہوا شائع کر دیا تھا۔ مولانا

مرحوم کا یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جو علمی حلقہ میں ہمیشہ بنظر استحسان دیکھا جائے گا۔''

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ماہنامہ الفرقان اپریل ۱۹۸۷ء میں فرماتے ہیں:

''مولانا (واصفؔ صاحب) مرحوم گوناں گوں کمالات کے حامل تھے علوم دینیہ سے لے کر اردو ادب تک پر ان کی گہری نظر تھی خطاطی اور املاء کے فنی ماہر تھے... ان کی بہت بڑی دینی و علمی خدمت یہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کے فتاویٰ کو نہایت سلیقہ سے مرتب فرما کر کفایت المفتی کے نام سے ۹ جلدوں میں شائع کیا۔''

مشہور صحافی جناب جمیل مہدی نے لکھا ہے:

''مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ دہلی کے قدیم و جدید دور کے ایک نمائندہ ادیب، شاعر اور عالم تھے۔ انھوں نے علمی دنیا پر سب سے بڑا احسان یہ یہ کیا کہ مفتی کفایت اللہؒ کے لاکھوں فتووں کا انتخاب ''کفایت المفتی'' کے نام سے نو ضخیم جلدوں میں شائع کر کے دین و فقہ کے ایک بڑے سرمایے کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ کفایت المفتی کی ۹ جلدیں یقیناً ان کی تالیفی صلاحیت، محنت اور سر مغزی کا ایسا ثبوت ہیں جو آنے والے لوگوں کیلئے ایک ولولہ انگیز مثال بنی رہیں گی۔ بلاشبہ یہ ایک آدمی کا کام معلوم نہیں ہوتا اور اس اعتبار سے حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے اسے خاموشی کے ساتھ انجام دے دیا۔''

(ماہنامہ برہان دہلی اپریل ۱۹۸۷ء)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے ''مفتی اعظم ہند'' میں لکھا ہے کہ:

''مسائل میں پایہ تحقیق کے ثبات اور درجہ استناد کی محکمی حضرت مفتی اعظمؒ کے ذوق تفقہ، تجر علمی، جامعیت علوم و فنون، کمال بصیرت، باریک بینی، نکتہ آفرینی کی شاہ کار ہے اور فتاویٰ کی حسن ترتیب اور تالیف و تدوین کا کارنامہ حضرت مرحوم کے خلف ارشد و اکبر مولانا مفتی حفیظ الرحمن واصفؔ مرحوم کے ذوق علمی اور محنت شاقہ کا رہین منت ہے۔'' (صفحہ ۸۰)

ڈاکٹر صاحب کفایت المفتی کی ترتیب وتدوین کی خصوصیات کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''ہر 'کتاب' (مثلاً کتاب الایمان وغیرہ) اپنے موضوع پر عنوان کتاب سے لے کر فصل کی سب سے چھوٹی اور آخری تقسیم تک اپنے موضوع کے تمام اطراف اور چھوٹے چھوٹے نکات علمیہ تک کی جامع ہے اور تمام مباحث کے درجہ استناد اور معیار تحقیق سے تالیف وتدوین وتقسیم مطالب اتنی علمی ہے کہ اگر مکررات جو ہر فتاویٰ میں ناگزیر طور پر پائے جاتے ہیں، حذف کردیئے جائیں تو ایک مسلمان کی عام اور روزمرہ کی چھوٹی بڑی انتالیس رہنما کتابیں تیار ہوجائیں گی، جو مختلف علوم وفنون کے اطراف پر محیط اور حسن وسلیقہ تالیف وتدوین کے لحاظ سے اپنے موضوعات پر شاندار اور محققانہ تصنیفات ثابت ہوں گی۔'' (صفحہ ۷۹)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم کے فتاویٰ کو کفایت المفتی کے نام سے تحقیق وتلاش کے بعد جمع کیا اور بڑی محنت اور جاں فشانی سے انکی تدوین کی اور ان کو نو جلدوں میں شائع کیا۔ یہ تنہا کارنامہ ایسا ہے کہ بڑے بڑے عالموں کو ان پر رشک آتا ہے۔''
>
> (ماہنامہ ذکروفکر دہلی اپریل ۱۹۸۷ء)

کفایت المفتی کے سلسلہ میں اس زمانے کے اخبار الجمعیۃ، مسلم وغیرہ مولانا نے جمع کیے۔ ان اخبارات میں مفتی صاحب کے فتوے شائع ہوتے تھے۔ اخبار سہ روزہ الجمعیۃ کی ابتداء سے تقریباً بیس سال کے اخبارات کے فائل نہ اخبار کے دفتر میں تھے اور نہ جمعیۃ علماء کے دفتر میں۔ مولانا نے پانچ چھ سال کی مشقت اور صرف کثیر کے بعد یہ فائل تیار کیے۔ اس کے دوسیٹ مکمل تیار ہوگئے۔ ان کو مجلد کرایا اور ایک سیٹ جمعیۃ علماء کو دیا کہ اب وہ اس کو محفوظ رکھیں اور وہاں یعنی ایک باقاعدہ ادارہ میں ریسرچ کرنے والوں کیلئے دستیاب رہیں۔ لیکن جب ریسرچ اسکالرز ان فائلوں کی تلاش میں مولانا کے پاس آنے لگے تو پتہ

چلا کہ جمعیۃ کے دفتر میں وہ بیس پچیس فائل دیمک کی نذر ہو چکے ہیں۔ الجمعیۃ کے فائل اس وقت انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر دہلی میں محفوظ ہوں گے کہ وفات سے چند ماہ قبل تاریخ کا یہ بیش بہا اور نایاب ذخیرہ حضرت مولاناؒ نے انسٹی ٹیوٹ کو عطا کر دیا تھا کہ ریسرچ کرنے والوں کو اس ذخیرہ تک سہولت سے رسائی حاصل ہو سکے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں بھی شاید وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ حال ہی میں ایک صاحب حیدر آباد سے ان فائلوں کی تلاش میں آئے تھے جو وہ پہلے مولانا کے پاس دیکھ چکے تھے۔ میں نے اس یقین کے ساتھ کہ انسٹی ٹیوٹ میں وہ فائل اچھی حالت میں محفوظ ہوں گے ان کو وہاں بھیج دیا۔ مگر وہ وہاں ان کی زیارت نہیں کر سکے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

درس الاسلام:

حضرت مفتی اعظمؒ کی شہرہ آفاق تصنیف تعلیم الاسلام کو حضرت مولاناؒ نے نظم کیا۔ ۱۳۷۸ھ میں اس کا پہلا حصہ مکمل ہوا۔ اس کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

صفر کی آج ہے تاریخ چوتھی ہے تیرہ سو اٹھتر سال ہجری
سہانی رات ہے پچھلا پہر ہے گداز شمع ہے سوز جگر ہے
مرتب پہلا حصہ کر چکا میں قلم کی طرح سجدے میں جھکا میں

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلویؒ فرماتے تھے کہ:

> ”ہم اکثر شام کو کتب خانہ رحیمیہ آتے تھے۔ مفتی (واصفؔ) صاحب اندرونی حصہ میں بیٹھتے تھے باہر منشی بیٹھتا تھا۔ احباب وہیں اندر بلا لیے جاتے تھے۔ تو مفتی صاحب جو حصہ ”درس الاسلام“ کا نظم کر چکے ہوتے تھے وہ سناتے تھے۔“

”درس الاسلام“ کے بارہ میں حکیم الامت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ”حضرت زید مجدکم السامی۔ سلام مسنون نیاز مقرون۔ رسالہ نافعہ درس الاسلام دو جلد موصول ہو کر باعث عزت ہوا۔ اسی وقت جگہ جگہ سے پڑھا

اور استفادہ کیا۔ ماشاء اللہ نہایت ہی دلآویز اور شیریں نظم ہے۔ نظم میں تخیل کی رنگینیوں کو کھپا دینا تو آسان ہے مگر دین اور اسکے احکام اور عقیدہ و عمل کا کھپانا بہت مشکل ہے مگر آپ کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس ممتنع کام کو سہل فرما دیا۔ میں نے تو جہاں سے بھی اس منظوم کو شروع کیا چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ یہ آپ کی ذکاوت اور حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے آثار خیر و برکت ہیں۔ میں اس خدمت کی توفیق اور انجام دہی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ دعاؤں میں یاد فرمائیں۔ جب دو حصے ارسال فرمائے گئے ہیں تو اگلے حصوں کا بھی مشتاق ہو گیا ہوں۔''

اردو مصدر نامہ:

یہ کوئی چار سو صفحات کی تحقیقی کتاب ہے جس میں خالص اردو مصادر اور ان کی اصل کی تحقیق شامل ہے۔ یہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن عنقریب آنے والا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس فرماتے ہیں:

> ''حضرت واصفؔ دہلوی مرحوم کے ذہنی انہماک کا بڑا مرکز تو علوم دینی ہی تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اردو شعر و ادب خصوصاً زبان کے مسائل میں بھی وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس میدان میں ان کی بعض کتب و رسائل میری نظر سے گزرے ہیں۔۔۔ ان کا ایک وقیع اور یادگار کام ''اردو مصدر نامہ'' ہے جس میں انھوں نے پوری صحت اور صراحت سے اردو کے تیرہ سو مصادر اور دو ہزار کے قریب مشتق الفاظ کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔ یہ اکیلا کام ایسا ہے جو اردو زبان کے محقق اور عالم کی حیثیت سے انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔''

مولانا کے اردو زبان کے اس بنیادی نوعیت کے تحقیقی کام کے بارے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی فرماتے ہیں:

> ''عربی فارسی اردو کے علاوہ لسانیات، عروض و قواعد پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ میں نے ان کی کتاب ''اردو مصدر نامہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان

موضوعات کی طرف جانے سے سنگلاخ وادیوں میں بھٹک جانے کا ڈر رہتا ہے مگر مولانا نے جس خوش اسلوبی سے اس وادی کو طے کیا ہے یہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔" (برہان دہلی اپریل ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی فرماتے ہیں:

"پچھلی نصف صدی میں اردو زبان اور اس کی ادبیات کے دائرے میں جس رجحان کا سب سے زیادہ عمل دخل رہا وہ ادبی تنقید ہے۔ لیکن مولانا نے اس کی طرف کم توجہ دی اسکے مقابلے میں زبان کی اساس انکے یہاں زیادہ اہم رہی اور وہ اس کی جڑوں کی تلاش پر زیادہ متوجہ رہے۔ 'اردو مصدر نامہ' ان کی اسی توجہ فرمائی کا نتیجہ تھا۔"

تذکرۂ سائلؔ:

نواب سائلؔ دہلوی کی سوانح حیات مولانا نے "تذکرۂ سائل" کے عنوان سے ان کے مداحوں اور عقیدت مندوں کے سامنے پیش کی۔ اور اب تک سائلؔ صاحب کا مطبوعہ کلام (مختلف مجلّات کے علاوہ) جو دستیاب ہوتا ہے وہ بھی "پارۂ کجکول" کے نام سے مولانا نے ہی شائع کیا تھا۔ تذکرہ سائل (جو پہلے قسط وار مضمون کی شکل میں برہان میں شائع ہوا تھا) کے بارے میں امنؔ لکھنوی کا ایک خط میں نے دیکھا جو انھوں نے مولانا کو لکھا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"بھائی واصفؔ صاحب۔ تسلیم۔ نواب سائل مرحوم کے متعلق آپ کا مضمون برہان میں برابر پڑھتا رہا ہوں۔ اس سے پہلے یہ جانتا تھا کہ آپ اچھے شاعر ہیں... اب تک یہ نہیں جانتا تھا کہ آپ ادیب بھی ہیں... آپ خوب لکھ رہے ہیں۔"

ناخدائے سخن تاج الشعراء حضرت نوح ناروی اس کے متعلق مولانا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"محب مکرم زاد لطفہ۔ سلام و دعا۔ آپ کا محبت نامہ ملا اور رسالے بھی

پہنچے۔ اس عنایت و توجہ کا شکریہ کہاں تک ادا کروں۔ علاوہ اسکے اور کیا دعا دوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شاد و آباد رکھے اور اعلیٰ مراتب پر پہنچا کر آپ کے بہی خواہوں کو مسرور ہونے کا موقع عطا کرے۔ تمہید یا دیباچہ اگرچہ مختصر ہے لیکن بہت خوب ہے۔ جس پیرایہ میں وہ لکھا گیا ہے اس کی بہت ضرورت تھی یعنی سب ضروری باتیں سامنے آگئی ہیں... خاندانی حالات کے مرتب کرنے میں آپ نے جو محنت کی ہے اور متعدد کتابوں سے امداد لی ہے یہ آپ ہی کا کام تھا پھر سب کتابوں کا حوالہ بھی آپ نے نہایت خوبی سے دیا ہے۔ شجرے تو آپ نے اس خوبی سے ترتیب دیئے کہ کوئی خاندان والا بھی نہیں دے سکتا تھا۔ جتنے شجرے ہیں وہ نہایت خوبی کے ساتھ ہیں اس سے زیادہ کوئی کیا مکمل کر سکتا ہے۔ جس قدر بھی اس تحقیقات کی داد دی جائے وہ کم اور بہت کم ہے۔ مجھے تو دیکھ کر حیرت ہوگئی۔"

پروفیسر قمر رئیس اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اپنے استاد حضرت سائل دہلوی کی سوانح "تذکرۂ سائل" کے نام سے انھوں نے لکھی جس میں ان کی زندگی، خاندان، مشاغل، احباب اور اردو زبان اور شاعری کے حوالے سے ان کی سرگرمیوں کا ایسا نقشہ کھینچا ہے اور اور دلّی کی تہذیب و معاشرت کے پس منظر میں ان کی سیرت کو اس طرح ابھارا ہے کہ لگتا ہے یہ کام ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔"

ادبی بھول بھلیاں:

مولانا کو اردو زبان و لغت کے مسائل، الفاظ کی اصل، لسانیات و قواعدِ زبان پر انتہائی عبور حاصل تھا۔ وہ لغت و زبان کے ماہر اور اس کے کھرے کھوٹے کے پرکھنے والے تھے۔ اِن علوم پر اُن کی جیسی دقیق نظر بہت کم دانشوروں کی ہوتی ہے۔ ان کی اس دقتِ نظر اور وسعت مطالعہ کا مظہر ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "ادبی بھول بھلیاں" ہے جو رشید حسن خاں صاحب کی دو کتابوں 'اردو املا' اور 'زبان و قواعد' پر نقد و تبصرہ ہے۔ یہ کتابی شکل میں

۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

اس کتاب کے متعلق خواجہ احمد فاروقی نے مولانا کو ایک خط لکھا تھا اس سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں:

"آپ کی کتاب ادبی بھول بھلیاں موصول ہوئی۔۔۔۔ بڑی عالمانہ کتاب ہے اور اس میں آپ نے بڑا خون جگر کھپایا ہے۔ اس کا نام بھی ایسا ہی وقیع ہونا چاہئے تھا۔ عرصہ ہوا ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے اس موضوع پر رسالہ ہندوستانی میں کئی مسلسل مضمون لکھے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ اس کام کو کون پورا کر سکے گا۔ بپایاں کہ رساند۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کام کے لیے انتخاب کیا۔ خدا آپکا سایہ ہمارے اوپر تا دیر قائم رکھے۔ اب اس درجہ کے عالم ہمارے یہاں نہیں ہیں۔"

پروفیسر قمر رئیس فرماتے ہیں:

"ادبی بھول بھلیاں" ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے جو اردو زبان، قواعد اور املا کے پیچیدہ مسائل پر ان کی گہری نظر کا غماز ہے۔ افسوس ہے کہ اب اردو زبان کے ایسے عارف اور نکتہ سنج نہیں رہے۔"

ڈاکٹر تنویر علوی فرماتے ہیں:

"زبان و ادب کے مسائل پر مولانا کی نظر کتنی گہری تھی اور اپنے مطالعہ اپنے مشاہدے اور اپنے ماحول کے اثرات سے انھوں نے کیا کچھ سوچا، سیکھا اور سمجھا اس کا اندازہ مولانا کے ان تبصروں سے ہوتا ہے جن کی حیثیت مستقل تالیفات کی سی ہے۔ زبان و ادب اور لفظ و معنی کے سلسلے میں کچھ بحثیں تو ایسی ہیں جو ہمارے ادب میں برابر ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس ضمن میں مولانا کا اپنا علمی نقطہ نظر اور تحقیقی طریقہ رسائی ان مباحث کو عمومیت کے دائرے سے باہر لے آتا ہے اور ان نئے رجحانات کی نمائندگی ان کے ذریعے سے ہوتی ہے، جو اردو میں تحقیقی رویوں اور ریسرچ کے نقطہ نظر سے مسائل پر غور و فکر کے نتیجے میں سامنے آیا ہے۔ اگر ہم مولانا کی کتاب "ادبی بھول بھلیاں" کو سامنے

رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان مباحث پر مولانا کی نظر کس قدر گہری تھی اور عام ناقدانہ رویے سے ان کی اپنی روش کو کس حد تک مختلف کہا جا سکتا ہے۔"

اردو مصادر کے عربی فارسی مترادفات پر مبنی ایک "سہ لسانی مصدر نامہ" مرتب کیا۔ مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ قرآن مجید کی ان آیات کا ترجمہ تفسیر و شرح کر کے "قرآنی پند نامہ" تحریر فرمایا جن کا تعلق آداب معاشرت سے ہے۔ حضرت مفتی اعظمؒ کی سوانح حیات سے متعلق ایک کتاب مفتی اعظم کی یاد مرتب کی۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا کہ حضرت مولانا واصفؔ صاحب مورخ بھی تھے۔ جمعیۃ علماء کی تاسیس کی تاریخ اور اس میں حضرت مفتی اعظم کے کلیدی کردار پر "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" لکھا۔ مدرسہ امینیہ دہلی کی تاریخ پر ایک مستند رسالہ تصنیف کیا جو متعدد بار طبع ہوا۔ مدرسہ حسین بخش دہلی کی تاریخ پر ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ "اردو مصدر نامہ" کا مقدمہ از خود ایک مستقل اہمیت کا حامل تاریخی مقالہ ہے۔ علاوہ ازیں مختلف دینی مسائل پر بھی "مطلقہ کی شرعی حیثیت" اور "عقیدہ اور رواداری" وغیرہ رسالے تحریر کیے اور شائع کرائے۔

ان کتابوں کے علاوہ مختلف لسانی و ادبی موضوعات پر بہت سے مضامین جو مختلف مجلات میں شائع ہوئے الگ ہیں۔ ان سب کو یکجا کر کے میں مرتب کر رہا ہوں۔ ان میں ادبی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے مضامین ہیں، تاریخی ہیں، دینی ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب منظر عام پر آئیں گے۔

زرگل:

مولانا کے شعری کلام کے مجموعہ کا نام زرگل ہے جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۷۶ء تک کی شاعری شامل ہے۔ اس میں ۱۷۸ غزلیں ہیں۔ نظموں میں مناجات، نعتیں، مختلف اہل علم کے مراثی، قطعات تاریخ، تہنیتی نظمیں، ملی و قومی نظمیں، سیاسی نظمیں وغیرہ کے عناوین سے نظمیں ہیں۔ ۷۷ رباعیات و قطعات بھی شامل ہیں۔

◆◆◆

غالب کا ایک شعر

(درج بالا عنوان کے تحت ایوان غالبؔ میں غالبؔ کے ایک شعر پر نقد و نظر کیلئے مذاکرہ کا ایک سلسلہ مئی ۱۹۸۴ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کی روداد اخبارات میں شائع ہوتی تھی۔ اکثر اشعار پر مولانا واصفؔ دہلوی نے بھی فنی و لسانی پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔ ان میں سے چند اشعار پر مولانا کے رشحات قلم پیش کیے جاتے ہیں)

چند روز ہوئے ایوان غالب میں مرزا غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر پر مقالہ پڑھا گیا اور بحث ہوئی۔ (جس کی مختصر کیفیت اخبار الجمعیۃ مورخہ ۵ر مئی ۱۹۸۴ء میں نظر سے گذری)

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

اس شعر کا مطلب راقم الحروف اپنے خیال کے مطابق عرض کرتا ہے:

مشرکین عرب کہتے تھے کہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ خالی بیٹھا ہوا ہے۔ اب اس کیلئے کوئی مشغلہ نہیں۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شأنٍ۔ یعنی ہر روز اس کیلئے ایک دھندا ہے۔ خالی نہیں بیٹھا ہے۔ خالق کائنات اپنی کائنات میں ہر وقت تصرف اور تغیر کرتا رہتا ہے۔ اس کے ذوق یعنی رجحان یا ارادہ سے تمام کارخانہ حرکت میں ہے۔ ذوق کا لفظ اس جگہ بہت مناسب ہے۔ یہ لفظ دلچسپی، شغل، رجحان، مشیت وغیرہ بہت سے معانی پر حاوی ہے۔

جس طرح آفتاب کے پرتو سے ذرہ میں جان ہے اسی طرح خالق کے تصرف سے کائنات متحرک اور متغیر ہے۔ پرتو کے معنی شعاع۔

شعر میں ذرہ سے مراد گرد و غبار کے ذرے نہیں ہیں جو روشن دان میں سے آتی ہوئی

کرن میں اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حکمانے کہا ہے کہ سورج کی روشنی بے انتہا باریک ذرات کا مجموعہ ہے۔ سورج روشنی کے ذرات اپنی قوت سے پھینکتا ہے اور وہ ذرات منزل مقصود پر پہونچ کر پھر سورج کی طرف واپس جا کر اس میں مل جاتے ہیں۔ یہ ایک مسلسل دورہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ خواجہ حافظؔ شیرازی کے شعر میں ذرہ سے مراد وہی روشنی کا ذرہ ہے۔ فرماتے ہیں:

کمتر از ذرہ نۂ پست مشو مہر بورز
تا بخلوتگہ خورشید رسی چرخ زناں

خلاصہ یہ کہ جس طرح آفتاب کی مقناطیسی قوت روشنی کے ذرات پر حاوی اور موثر ہے اسی طرح خالق اپنی کائنات میں ہر وقت موثر و متصرف ہے۔

غالبؔ کے اس شعر میں تصوف ہے یا علم کلام یا فلسفہ؟ یہ سمجھنا اہل علم حضرات کا کام ہے۔

(اخبار ہفت روزہ ہماری زبان مورخہ ۸؍ستمبر ۱۹۸۴ء میں کسی نے لکھا کہ غالب کا یہ شعر ناموزوں ہے اور یہ کہ چند اہل علم حضرات نے بھی اس کو وزن سے خارج بتایا ہے۔ اس پر مولانا واصفؔ دہلوی نے اس کی تقطیع کر کے اس کی تردید کی۔ قاسمؔ)

اس شعر پر بمقام ایوان غالب مذاکرہ ہوا تھا۔ اُس وقت غالباً اس کی ناموزونیت کا مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ علم عروض بہت خشک علم ہے۔ مہارت کیلئے بہت محنت چاہتا ہے۔

واضح ہو کہ غالب کا شعر وزن سے خارج نہیں ہے۔ اس میں نہ کتابت کی غلطی ہے نہ اصلاح کی ضرورت۔ جو وزن لکھا ہے اُسی پر اس کی تقطیع ہوگی۔ اس طرح:

ہے کاءِ۔ ناتَ کوحَ۔ رَکت تیرِ۔ ذوق سے
مفعول۔ فاعلات۔ مفاعیل۔ فاعلن
پرتوسِ۔ آفتاب۔ کِ ذررے مِ۔ جان ہے

یاد رہے کہ لفظ حرکت کو غالب نے بفتحتین باندھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ نیز یہ کہ لفظ "کو" کا واؤ ساقط نہیں ہے کھینچ کر پڑھا جائے۔

مورخہ ۲۶ رمئی ۱۹۸۴ء کو ایوان غالب میں ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ہوا۔ اور غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر پر مقالہ پڑھا گیا:

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دستگرداں ہے

اس شعر میں صرف ایک لفظ ایسا ہے جس کا حقیقی مفہوم واضح ہو جانے کے بعد زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

دست گرداں: اتفاقی ضرورت کے وقت کسی سے کوئی چھوٹی سی رقم لے لی جائے تو یہ قرض دستگرداں کہلاتا ہے۔ مثلاً بازار میں کوئی سودا خرید رہا ہے۔ اتفاق سے جیب میں سودے کی پوری قیمت موجود نہیں ہے یا ایک دو روپے کی کمی ہے۔ کوئی واقف آدمی نظر پڑتا ہے وہ اس سے کہتا ہے لانا بھئی دو روپے دینا۔ یہ قرضہ عارضی اور نقد ہے۔ حساب کی کتابوں میں اور اُدھار کھاتے میں کہیں اس کا اندراج نہیں ہوتا۔ اور دوسری ملاقات میں جلد سے جلد ادا کر دیا جاتا ہے۔ ملاقات میں دیر ہو تو کسی آدمی کے ہاتھ بھیج دیا جاتا ہے۔ شاید اس کو اُچنتی یا اُچاپت بھی کہتے ہیں۔

دوسری صورت مال کی ہے۔ ایک دکاندار کے پاس گاہک آتا ہے اور کوئی چیز طلب کرتا ہے۔ وہ چیز دکاندار کے پاس موجود نہیں، وہ فوراً اپنے نوکر کو دوسرے دکاندار کے پاس بھیج کر وہ چیز منگا کر گاہک کو دکھاتا ہے۔ اس میں عام رواج کے مطابق یہ شرط معلوم و متعین ہے کہ اگر گاہک نے وہ چیز خرید لی تو اس کی قیمت اُس دکاندار کے پاس فوراً بھیج دی جائے گی اور گاہک نے نہیں خریدی تو فوراً وہ چیز واپس کر دی جائے گی۔ اس طرز معاملہ کو ہندی میں جاکڑ اور اردو میں دست گرداں کہتے ہیں۔ یہ سودا ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہے۔ اور ادھار کھاتہ میں اس کا اندراج نہیں ہوتا۔

شاعر کہتا ہے کہ اگر تجھے ساغر کی آرزو ہے تو دل و دین دے کر ساقی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی نقد۔ کیونکہ اس بازار یعنی بازار معرفت میں جاکڑ مال کی طرح نقد قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اور ساغر اتنا گراں اور بیش قیمت مال ہے کہ اس کی قیمت میں دل و دین سے کم درجہ کی کوئی چیز مقبول نہیں۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین کو قربان کردینے کے بعد بھی معرفت حاصل ہوسکتی ہے؟ وہ شراب جذب وجنون کا ساغر ہے۔ اتباع دین اور ریاضت ومجاہدہ کی منزلیں طے کرنے کے بعد مقام جذب آتا ہے۔ وہاں پہونچنے کے بعد انسان کی مکلفیت (ذمہ داری و پابندی) ختم ہوجاتی ہے اور وصول الی الحق کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ مجذوب و مجنون اعمال واحکام شرعیہ کا مکلف نہیں رہتا۔ بعض مرتبہ گاہک پہلے مال پر قبضہ کرلیتا ہے اس کے بعد قیمت ادا کرتا ہے یا ادائگی اور وصولی ایک وقت میں ہوجاتی ہے ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت مان لی جائے۔ پھر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا۔ بازار سے مراد بازار معرفت ہے۔ یہ کوئی غیر مانوس تعبیر نہیں ہے۔ فارسی کا ایک شاعر کہتا ہے:

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی
بازار خویش و آتش ما تیز می کنی

جن لغت نویسوں نے متاع دست گرداں کے معنی میں بازارؤ اور گھٹیا مال لکھ دیا ہے انھوں نے غلطی کی ہے۔ بازارؤ یا گھٹیا مال کی کوئی علیحدہ دکانیں نہیں ہوتیں۔ سب دکاندار میل کے طور پر گھٹیا بڑھیا ہر قسم کا مال رکھتے ہیں۔ متاع دست گرداں میں گھٹیا بڑھیا کی کوئی قید اور تخصیص نہیں ہے۔

اگر اس کے معنی عاریت بتائے جائیں تو وہ بھی صحیح نہیں۔ عاریت وہ چیز ہوتی ہے جو کسی دوست یا پڑوس سے تھوڑی دیر کے استعمال کے لئے مانگ لی جاتی ہے۔ اور اس سے کام نکال کر یا مستفید ہوکر واپس کردی جاتی ہے۔ اس میں خرید وفروخت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شعر زیر بحث میں صنعت ایہام بڑی پر لطف ہے۔ ترکیب نحوی کے لحاظ سے دست گرداں کے معنی ہیں ہاتھوں میں چلنے اور چکر لگانے والا۔ اور ساغر کی یہی شان ہے کہ محفل میں ہاتھوں ہاتھ چلتا ہے۔ شعر میں متاع کی مناسبت سے جو الفاظ آئے ہیں وہ برمحل ہیں۔ بندش بھی چست ہے۔

صاحب بہار عجم نے دست گرداں کی سند کے طور پر جتنے اشعار دیئے ہیں ان میں دستگرداں کے معنی گھٹیا اور بازارو مال کے نہیں نکلتے صرف ایک آخری شعر امیر خسرو کا ایسا

لکھا ہے جس سے شک ہوتا ہے کہ دستگرداں سے سستا اور گھٹیا مال مراد ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

حریف معنی گل را بجاں خرد ہر چند
کہ سہل قیمت کالائے دستگر دانست

اُس سے زیادہ کون بیوقوف ہوگا کہ سستا اور گھٹیا مال ہونے کے باوجود اپنی جان سے اس کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ دعویٰ بلا دلیل۔

معلوم نہیں صاحب بہار عجم نے یہ شعر کہاں سے لیا ہے۔ میرے پاس جو نسخہ ہے اس میں یہ شعر اس طرح ہے:

حریف معنی گل را بجاں خرد ہر چند
کہ سہل قیمت کالائے دہر ارزانست

اس میں دست گرداں کا لفظ ہے ہی نہیں۔ اللہ اللہ خیر صلاّح۔

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

پہلے ہمیں فن کی رو سے شعر کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ شاعر نے ذرہ کا جام سے استعارہ کیا ہے۔ یعنی ذرہ کو ایک جام قرار دیا ہے۔ وجہ تشبیہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا ہے۔ ذرہ کی جام کے ساتھ کس چیز میں مشابہت و مناسبت ہے۔ پھر سرشار (لبریز) ہونے کی نسبت جام کی طرف محض لفظی مناسبت ہے خود جام تو تمنا سے سرشار ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ''جام ہر ذرہ شاعر سے سرشار تمنا ہے'' وہ تمنا کیا ہے؟ اور شاعر ایسی کونسی قادر و مختار ہستی ہے جو جام ہر ذرہ کی حاجت روائی کر سکے اور اس کی تمنا پوری کر سکے۔ ان سوالوں کا معقول جواب نہیں ملتا۔ ایک جگہ مرزا غالبؔ نے دل ہر قطرہ کہا ہے۔ اگر یہاں دل ہر ذرہ کہا جاتا تب بھی کچھ بات بن جاتی کہ دل ہی تمناؤں کا مسکن ہے۔

اب دوسرے مصرع کو لیجئے۔ شاعر خود اپنی ہستی کو دل قرار دیتا ہے۔ دل سے شاعر کی مجسم و مکمل ہستی کا استعارہ ہے۔ اس میں بھی وجہ تشبیہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر نے اپنے وجود کو جس کے دو ہاتھ، دو پانو، دو آنکھیں، دو کان وغیرہ

ہیں کس بنا پر دل قرار دیا ہے۔ پھر کس کا دل ہوں؟ شاعر خود سوال کرتا ہے۔ اس کا جواب نہ شاعر کے کلام میں ہے نہ سننے والے کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور مصرع کی ترکیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل یعنی ایک عضو حیوانی فطری اور عادی طور پر ایک عالم سے لگایا جاتا ہے۔ لیکن میں کس کا دل ہوں کہ مجھ کو دو عالم سے (یا دو عالم میں) لگا دیا گیا ہے۔ اگر انسان کا دل مراد ہے تو دل کہنے کی ضرورت نہیں۔ انسان کو اور اس کے تمام جوارح کو اللہ نے دو عالم کا کام سونپ دیا ہے۔ اور خالق کی طرف دل کی اضافت کرنا اُس کی شان کو گھٹانا ہے۔ اُس کا تو ارادہ اور مشیت ہے۔ وہ مضغۂ گوشت کی احتیاج سے منزہ ہے۔

اس کے بعد دیکھنا ہے کہ دونوں مصرعوں میں ربط کیا ہے۔ اور ہر ذرہ کا دل مجھ سے (شاعر سے) کیا تمنا رکھتا ہے۔ شاعر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر یہ کہ وہ تمنا اگر شاعر پوری نہیں کرسکتا تو کون پوری کرے گا۔ اگر یہ تاویل کی جائے کہ مجھ سے کا مطلب ہے میری وجہ سے یعنی جامِ ہر ذرہ خالق سے تمنا رکھتا ہے میری وجہ سے تو سوال پھر بھی باقی ہے کہ وہ تمنا کیا ہے۔ ہر ذرہ کا سرشار تمنا ہونا۔ شاعر کا اپنی جنس تبدیل کرکے دل بن جانا۔ یہ دو دعوے ہیں بلا دلیل۔ پھر آپس میں ان کا تعلق علت معلول کا ہے یا شرط و جزا کا؟ جواب کچھ نہیں ملتا۔

غرضیکہ شعر مذکور اپنی بندش اور انتخاب الفاظ اور زبان کے لحاظ سے مرزا غالب کی شان کے لائق نہیں ہے کافی حد تک مہمل ہے اور المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کہاں تک کامیاب ہے۔

میرا قیاس یہ ہے کہ شاعر ایک اہم اور وسیع مضمون کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ الخ مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا یہ سب اُس کا وزن اٹھانے سے قاصر تھے۔ اس کو قبول کرنے سے ڈرے۔ اور انسان ناتوان ضعیف البنیان نے اس کو اٹھا لیا۔ الخ۔ وہ امانت کیا ہے؟ اللہ کی عبادت، زمین پر اس کی نیابت اور اس کے دین کا اجرائ۔

مبدأ و معاد کی اس ذمہ داری (مکلفیت) کو قبول کرنے کی وجہ سے اللہ نے انسان

کو اشرف المخلوقات کا خطاب عطا فرمایا۔ اس سونپے ہوئے کام کو پوری فرض شناسی اور فرماں برداری کے ساتھ جن بندوں نے انجام دیا آخرت میں ان کے مراتب بہت بلند کیے گئے۔ جب کائنات نے یہ دیکھا کہ امانت برداری کی وجہ سے انسان نے کس قدر عظمت و برتری حاصل کر لی تو ان کو یہ آرزو ہوئی کہ کاش ہم اس امانت کو قبول کر لیتے اور وہ عظمت و برتری حاصل کر لیتے جو انسان کو حاصل ہوئی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ میری وجہ سے سرشار تمنا ہے۔ اگر واقعی شاعر نے اسی مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے خطا معاف! شاعر اس کو جامع و مانع طور پر ادا کرنے میں قطعاً ناکام ہے۔

اس شعر کے بارے میں کسی نے یہ بھی فرمایا کہ "غالب کا زیر بحث شعر کم از کم دو بحروں (رمل اور رجز) میں تقطیع کیا جا سکتا ہے"۔ اگر یہ بھی واضح کر دیا جاتا تو اچھا ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی بحروں میں اُس کی تقطیع کی جا سکتی ہے۔ نیز تقطیع کے ارکان تحریر فرما دیئے جاتے تو لوگوں کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوتا۔

میرا مجموعہ کلام "زرگل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اُس کے صفحہ ۵۴ پر ایک غزل ہے جس کا ہر مصرع دو وزنوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ دونوں کے ارکان شروع میں لکھے ہوئے ہیں۔

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

کہتے ہیں عنقا ایک پرندہ تھا جس کی نسلِ معدوم ہوگئی۔ اب معدوم اور فرضی چیز کیلئے عنقا کا لفظ بولا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری ہستی حیرت آباد تمنا کی سنسان فضا ہو کر رہ گئی ہے۔ حیرت آبادِ تمنا وہ دل جس میں کبھی تمنائیں آباد تھیں اب ان کی جگہ حیرتیں آباد ہیں۔ حیرت اپنی تمناؤں کی مسلسل اور طویل ناکامیوں پر ہے۔ جبکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان بقدر اپنی محنت و کوشش کے پھل پاتا ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (الآیۃ) لیکن میری پیہم ناکامیوں نے سنسان اور اداس فضا کی طرح مجھ کو ساکن و ساکت بنا دیا ہے۔

انسان جب حیران اور ہکا بکا ہو کر رہ جاتا ہے تو حواس زائل ہوتے ہیں اور راحت و

اذیت کا احساس نہیں رہتا۔ میں جس عالم میں ہوں نالہ وفغاں اُسی عالم کا پرندہ ہے جس کا نام عنقا ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ مقام حیرت سے معرفت الٰہی مراد لی جائے۔ فرمایا ہے (بطور استفہام انکاری) اَمْ لِلاِنْسَانِ مَا تَمَنّیٰ؟ (الآیۃ) کیا انسان کو مل جاتا ہے جو کچھ وہ چاہے؟ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں: عرفتُ اللہ ربّی بفسخِ العزائم۔ یعنی پہچانا میں نے اپنے پروردگار کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے۔

تمناؤں کی ناکامی بھی رہی اور ہمارا سفر بھی جاری رہا اور صبر ورضا کے ساتھ منزل نالۂ وفغاں سے گذر کر مقام حیرت میں پہونچ گئے۔

(۲۹ ستمبر ۱۹۸۴ء کو غالبؔ کے درج ذیل شعر پر مباحثہ ہوا)

وہم طرب ہستی ایجاد سیہ مستی
تسکین دہ صد محفل یک ساغر خالی
ہے

پوری غزل میں سات شعر ہیں۔ چونکہ غزل مسلسل ہے یعنی مضمون کے لحاظ سے تمام شعر مربوط اور ہمرنگ ہیں اس لئے پوری غزل کی تشریح مناسب سمجھی گئی۔

بیتابی یادِ دوست ہمرنگ تسلی
ہے
غافل تپش مجنوں محمل کش لیلیٰ
ہے

دوست کی مضطربانہ یاد تسلی کا حکم رکھتی ہے۔ اے غافل! مجنوں کی تڑپ لیلیٰ کے محمل کو کھینچ لاتی ہے۔ عاشق کا دل دوست کی یاد سے تسلی واطمینان پاتا ہے۔ اَلا بِذِکرِ اللہِ تَطْمَئِنُّ القُلوب۔

کلفت کشی ہستی بدنام دورنگی
ہے
یاں تیرگی اختر خال رخ زنگی
ہے

دنیاوی زندگی پر دورنگی کا الزام ہے کوئی خوش حال کوئی بد حال ہے۔ لیکن اختر قسمت کی تیرگی بھی ایک حسن رکھتی ہے۔ جیسے کہ خال سیاہ موجب ازدیاد حسن ہے۔ اگرچہ رخ زنگی کا تل اس کی سیاہ جلد کا ہمرنگ ہونے کی وجہ سے ماند پڑ جاتا ہے مگر پھر بھی خال رخ

ہے۔ دورنگی اور بوقلمونی ہی اس عالم کی زینت ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہستی کا مکلف بننے کے بعد مصائب و آلام کی تیرگی ہی تیرگی ہے۔ مسرت کی تابانی ہے ہی نہیں۔ اختر قسمت بھی سیاہ وجود بھی سیاہ۔ پس دورنگی کا الزام غلط ہے۔ صرف ایک ہی رنگ ہے۔ ظلمت ہی ظلمت۔

دیدن ہمہ بالیدن کردن ہمہ افسردن
خوشتر زگل و غنچہ چشم و دل ساقی ہے

گل و غنچہ کا منظر دیکھنے میں نشوونما اور ترقی ہے۔ لیکن عملی طور پر اس کا انجام پژمردگی ہے۔ پس چشم ساقی کا نظارہ اور دل ساقی سے فیض یابی گلگشت چمن سے بہتر ہے۔

وہم طرب ہستی ایجاد سیہ مستی
تسکین دہ صد محفل یک ساغر خالی ہے

ہماری سیہ مستی یعنی حقائق سے بے خبری و غفلت نے مسرت و بے فکری کا ایک وہم پیدا کیا ہے۔ اور اس خالی ساغر یعنی کاسہ گردوں کی گردش دنیا کے مختلف ادوار کی اجتماعی و تمدنی زندگی کو تسکین دیتی رہی ہے۔ یعنی کائنات کا انسان کی خدمت کیلئے متحرک رہنا انسان کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ حالانکہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر عیش و عشرت اور بے فکری سے زندگی گذار لینا ہی مقصد زندگی نہیں ہے۔ اس زندگی کا مقصد محض یہ زندگی نہیں ہے۔

نشہ کے تین درجے ہیں: مستی، بدمستی، سیہ مستی۔ یہ آخری درجہ وہ ہے جس میں آدمی بالکل غافل و بے خبر ہوجاتا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار　شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری
(سعدیؒ)

زندان تحمل میں مہمان تغافل ہیں
بے فائدہ یاروں کو فرق غم و شادی ہے

اُس کی بے نیازی نے ہم کو تحمل کے زندان میں بطور مہمان رکھا ہے۔ یعنی ہمارا قیام

عارضی ہے۔ جو کچھ بھی پیش آئے اس کا تحمل کرنا ہمارا وظیفہ ہے۔ نیز میزبان کے کسی برتاؤ کا گلہ کرنا مہمان کیلئے مناسب نہیں۔ غم وشادی کا فرق کرنا اور اس سے متاثر ہونا بے نتیجہ ہے۔ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔ کُن فی الدُنیا کَاَنَّکَ غَرِیبٌ اَو عَابِرُ سَبِیلٍ۔

ہووے نہ غبار دل تسلیم زمیں گیراں
مغرور نہ ہو ناداں سر تا سر گیتی ہے

ملک گیری کے حریص فاتحوں کو غبار دل بھی نہیں سونپا جاتا جو ایک بے حقیقت چیز ہے۔ یعنی کتنی ہی زمین فتح کر لی جائے سب ہیچ ہے۔ اے نادان مغرور نہ ہو۔ یہ سر پر غرور دنیا کے حاصل ہونے تک ہے۔ ہر کمالے را زوالے۔ دنیا سے متمتع ہونے کی مدت بہت کم ہے۔ قُل مَتاعُ الدنیا قَلِیلٌ۔

رکھ فکر سخن میں تو معذور مجھے غالبؔ
یاں زورق خودداری طوفانی معنی ہے

اے غالبؔ تو مجھے فکر سخن میں معذور رکھ کیونکہ یہاں خودداری کی کشتی معانی و مضامین کے طوفان میں گھری ہوئی ہے۔ طبیعت کو فکر سخن سے روکنا مشکل ہے۔

غالبؔ کی مشکل پسندانہ شان کو نظر میں رکھتے ہوئے جو کچھ سمجھ میں آیا (یا نہیں آیا) تحریر کر دیا گیا۔

مرزا غالبؔ غزل مندرجۂ بالا کو اور اسی قسم کی دیگر غزلوں کو بتصرف قلیل اپنے فارسی کلام میں شامل کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بیکار اردوئے معلیٰ پر احسان فرمایا۔ مثلاً اس طرح:

بیتابیٔ یاد دوست ہم رنگ تسلی ہست   غافل تپش مجنوں محمل کش لیلیٰ ہست
کلفت کشی ہستی بدنام دورنگی ہست   ایں تیرگیٔ اختر خال رخ زنگی ہست
دیدن ہمہ بالیدن کردن ہمہ افسردن   خوشتر زگل و غنچہ چشم و دل ساقی ہست
وہم طرب ہستی ایجاد سیہ مستی   تسکیں دہ صد محفل یک ساغر خالی ہست
زندان تحمل ہست مہمان تغافل اند   بے فائدہ یاراں را فرق غم وشادی ہست
گردد نہ غبار دل تسلیم زمین گیراں   مغرور نشو ناداں سرتاسر گیتی ہست
در فکر سخن مارا معذور بکن غالبؔ   ایں زورق خودداری طوفانیٔ معنی ہست

اگرچہ فارسی میں ڈھلنے کے بعد بھی کلام کا اغلاق فارسی داں طبقے کے لئے اور ایرانیوں کے لئے بھی دردِسر رہتا مگر غریب اردو کی جان بچ جاتی۔ اسی واسطے مرزا کے فاضل تلامذہ کے بورڈ نے ان کے ایسے کلام کو (جس کو نہ فارسی کہہ سکتے ہیں نہ اردو) انتخاب کے وقت علیحدہ کر دینا ہی مناسب سمجھا اور بقیہ مجموعہ اردو اُن کی شہرت کا سبب بنا۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں نے مرزا غالبؔ کے کلام میں تصرف کیا ہے۔ حاشا وکلاّ۔ یہ جرأت میں نہیں کر سکتا۔ نہ کسی کو کسی کی تصنیف میں تصرف یا تبدیلی کا حق پہونچتا ہے۔ میں نے ایک مثال کے طور پر عرض کیا ہے کہ خود اگر غالبؔ ایسا کرتے تو ان کیلئے کچھ مشکل نہ تھا۔

غالبؔ کی غزل میں ویدانت کا فلسفہ ہے یا رومی، ایرانی، ہندوستانی تصوف یا گوئٹے کے مکاشفات یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ غالبؔ اُسی معاشرے کے ایک رکن تھے جو مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ، مولوی فضل حق خیر آبادی، نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب قطب الدین خاں، بہادر شاہ ظفرؔ، نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ، مولانا فخر الدین وغیرہ سے مرکب ہو کر وجود میں آیا تھا۔ وہ اپنے دور کے معاشرے اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت اُس معاشرے اور تہذیب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

اس شعر کو بہت گہری نظر سے دیکھیے۔ ایک ایک لفظ پر سر دھنیے اور لوٹ لوٹ جائیے۔ خاص اس پر غور کیجیے کہ حیا کیوں آتی ہے۔ رِضوانٌمنَ اللّٰہِ اَکبَرُ۔

لیکن جب ہمارے ادب میں اجنبی فلسفہ آیا تو انداز کلام بدل گیا۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

معاشرہ اور تہذیب کی تبدیلی نے ہی ایسے لوگ بھی پیدا کر دیئے جنھوں نے میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ کی شاعری کو مبتذل شاعری اور قدیم نیم وحشی شاعری قرار دیا۔

ترقی پسند شاعری کی صورت میں آیندہ نسلوں کیلئے بزعم خود پاکیزہ شاعری، فصیح وبلیغ زبان اور صالح لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ مہیا کر کے رکھ دیا۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔ (اس موضوع پر مقالہ ''ترقی معکوس'' بھی دیکھا جائے)

(۲۴ نومبر ۱۹۸۴ء کو غالبؔ کے درج ذیل شعر پر ڈاکٹر عمیق حنفی نے مقالہ پڑھا)

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

زنگار: لوہے کے زنگ کو کہتے ہیں۔ آئینہ دراصل لوہے کا ایجاد ہوا تھا (بعہد اسکندر بادشاہ) یعنی لوہے پر جلا کر کے عکس کے قابل بنایا گیا۔ بعد میں ترقی یافتہ صورت میں شیشے پر پارہ کی قلعی کر کے بنایا گیا۔ مگر شعراء نے اپنی وضعداری کو نہیں چھوڑا۔ آئینہ کیلئے زنگ کا لفظ آج تک استعمال کرتے ہیں۔ سرد اور مرطوب ہوا سے لوہے میں زنگ لگتا ہے۔

شاعر اپنے آپ کو یا اپنے دل کو ایک آئینہ قرار دیتا ہے اور اس آئینہ میں جلوۂ دوست کے سوا کسی کا جلوہ یا عکس نہیں ہونا چاہئے۔ دوست کی سرد مہری سے اس آئینہ پر زنگ آگیا یعنی مایوسی اور افسردگی طاری ہوگئی۔ اتفاقاً دوست نے اِدھر دیکھ لیا اور اس کو آئینہ پر زنگ نظر آیا تو وہ اس کو طوطی کا عکس سمجھا۔ یہ محض اس کی بدگمانی تھی ورنہ یہاں اُس کے پرتو کے علاوہ کسی کا کیا دخل؟ اور اگر طوطی ہو بھی تو کوئی حرج نہیں۔ کلمہ اسی کا پڑھے گا۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

طوطی ایک خاکی رنگ کا پرندہ ہوتا ہے۔ ایران وغیرہ میں پایا جاتا ہے اور زنگ کا رنگ بھی تقریباً خاکی ہوتا ہے۔

مصرعہ اولیٰ میں لفظ ''کیا'' اگرچہ حرف استفہام ہے مگر محاورے میں استعجاب اور اظہار کثرت وشدت اور انکار کے لئے بھی آتا ہے۔ شعر زیر بحث میں استفہام مقصود نہیں ہے۔ صرف یہی ایک نہیں بلکہ دیگر کلمات استفہامیہ دوسرے مفہوم کیلئے بھی آتے ہیں۔ کلام غالبؔ میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر   جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا   رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل   بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

زنگار اسی کی سرد مہری کی وجہ سے آیا لیکن وہ مجھ سے اتنا بدگمان رہنے کا عادی ہے کہ اس زنگار کو بھی میری خطا یا بے وفائی قرار دیتا ہے حالانکہ اِس کی ذمہ داری اُسی پر ہے۔ زنگار عارضی چیز ہے۔ اس کی ذرا سی نظر التفات سے اس کا رنگ دور ہو جائے گا اور اسی کی تصویر ابھر کر نظر آئے گی۔

(''ادبی بھول بھلیاں'' سے ایک اقتباس بھی پیش ہے)

نشہ۔ نشوونما

فاضل مصنف نے صفحہ ۱۳ پر مولانا حالی کا ایک اقتباس دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اردو میں نشا بروزن وفا بولا جاتا ہے اور اسی طرح فصیح ہے۔ اگرچہ اردو میں نسأۃ بروزن وحدت ہے۔''

صفحہ ۲۲۱ پر نشوونما کے تحت فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ:

''اصلاً نون ثانی پر زبر ہے (نشوونَما) نور میں صراحت بھی کی گئی ہے کہ نُما بضم اول غلطی سے بول چال میں ہے حالانکہ سبھی نشوونُما بضم نون ثانی کہتے ہیں۔ اردو میں بضم نون ثانی ہی مرجح ہے''

واصف عرض کرتا ہے: عربی میں ایک مادہ ن ش ء (مہموز اللام) ہے۔ مجرد میں اس کے مصادر یہ ہیں: نشأ (بروزن نظم) نُشوء (بروزن اصول) نشاء (بروزن جمال) نشأۃ (بروزن وحدت) نَشاءَۃ (بروزن علامت) اس کے معنی زندگی پانا، پیدا ہونا، نیا ہونا، پلنا بڑھنا۔ ان میں سے اردو میں تین وزن استعمال ہوتے ہیں۔ پہلا نسأ بروزن نظم۔ نشوونما میں یہی لفظ ہے۔ ہمزہ کے لئے واؤ لکھ کر ہمزہ لگانے لگے۔ جیسے مؤذن اور مؤرخ میں لکھتے ہیں۔ پھر تلفظ بھی واو کا ہو گیا۔ صحیح تلفظ یہ ہے: نَ شْ ئُ نُ مُ وْ یا اُس کا دوسرا وزن نشوء بروزن اصول ترکیب میں لایا گیا ہوگا۔ کثرت استعمال اور اصل سے ناواقفیت کی وجہ سے

ہمزہ غائب ہو گیا۔ اور تلفظ بھی بدل گیا۔ چوتھا اور پانچواں وزن ادبی کتابوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نشأۃ ثانیہ اور نشاءۃ ثانیہ۔ مجرد کا صرف ایک مشتق ''منشا'' اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ منشا کے معنی زندگی پانے، ظہور پذیر ہونے، تجدید پانے، جوان ہونے اور بڑھنے کی جگہ۔ مولد و منشا کی ترکیب میں یہی لفظ ہے۔ معنی مجازی مقصد و خواہش اور داعیہ۔

باب افعال میں جا کر متعدی بنتا ہے۔ اِنْشاءٌ۔ یہ مصدر اور اس کا اسم فاعل منشی (بمعنی محرر) اردو میں مستعمل ہیں۔ غرضکہ فارسی لفظ نشہ سے اس مادہ کو کوئی نسبت نہیں۔ اس موقع پر منیر لکھنوی اور مولانا حالی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

ایک دوسرا مادہ ن ش و (ناقص واوی) ہے۔ اس کا ایک مصدر نشو بروزن نظم ہے۔ دوسرا نشوۃ بحرکات ثلاثہ بروزن وحدت و فطرت و قدرت۔ اس کے معنی شراب سے مست ہونا۔ باب افتعال میں جا کر انتشاءٌ اور باب تفعل میں جا کر تنشی بروزن تسلی و تجلی بنا۔ معنی وہی رہے۔

صحاح جوہری، تاج العروس، لسان العرب، اقرب الموارد، المنجد کسی میں اس کا متعدی نہیں ملتا۔ اردو میں منشّی اور منشّیات کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ منشّی بروزن مقوی باب تفعیل تنشیہ بروزن تجزیہ کا اسم فاعل ہے لیکن جدید عربی میں اس کے معنی کلف دینے کے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مؤلف مصباح اللغات نے لازم کے معنی میں انتشیٰ و تنشّیٰ کو کہاں سے لکھ دیا۔ بہر حال میرا خیال یہ ہے کہ منشّی بروزن مقوی عربی میں مسکر یعنی نشہ آور کے معنی میں نہیں ہے۔ لفظ نشہ سے اہل ہند نے بنا لیا اور فصیح قرار پایا۔

لفظ نشہ کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ فارسی نہیں ہے بلکہ مفرس ہے۔ نَشْوَۃٌ میں تصرف کیا ہے یعنی واؤ کو ہمزہ سے بدل کر نشئہ (نَ شْ ءَ ہ) بنایا اور متاخرین اور خاص کر فارسی گویانِ ہند نے ہمزہ کو شین سے بدل کر شین کو شین میں مدغم کر دیا نشّہ (نَ شْ شَ ہ) ہو گیا۔ اردو والوں نے مزید تصرف کر کے شین مشدد کو مخفف کر دیا۔

ساقیا نشہ نیست منظورم رفع رنج خمار می باید
نشاختی بکجا روی کجا بایں سفر آمدی تو خراب نشہ کیستی کہ زخویش بے خبر آمدی
(خواجہ میر دردؔ)

واضح ہو کہ اردو میں بروزن پشہ اور بروزن وفا دونوں درست ہیں۔ مگر املا بہائے مختفی ہوگا نشہ نہ کہ نشا۔

بہارِ عجم میں سند کے طور پر جتنے شعر دیئے ہیں سب میں اس لفظ کا املا غلط لکھا ہے۔ مذکورہ دو صورتوں کے علاوہ اس کا کوئی تیسرا املا ہو ہی نہیں سکتا۔ بیدلؔ کے کلام میں بھی ایک جگہ یہ غلط املا موجود ہے اور دوسری جگہ صورت ثانی کے مطابق ہے۔

محبت در عدم بے نشاء نپسندد غبارم را
ہماں گرد سرے میگردم و پیمانہ می سازم (دیوان بیدلؔ)
چہ رسد ز نشہ معنوی بدماغ پیچش بے خبر
زپری پیاے اگر کشی بدکان شیشہ گراں مبر (نکات بیدلؔ)

میرزا مظہر کے کلام میں بھی یہ غلط املا موجود ہے۔

نشاء معنی ست در صورت پرستیہائے من
از حقیقت بادہ در جام مجازم کردہ اند

جب واؤ کو ہمزہ سے تبدیل کیا گیا اور آگے ہائے مختفی ہے تو ہمزہ کی نشست کے لئے ایک شوشہ ''ی'' کا لازمی ہونا چاہئے۔ جیسے دائم، سائل، مسئول اور مسئلہ میں ہے۔ صحیح املا وہی ہے جو ہم نے صورت اول میں بتایا ہے۔ یعنی نون کے بعد چار دندانے ہیں۔ تین دندانے شین کے اور ایک ہمزہ کے لئے۔ اس کے بعد ہائے مختفی۔ اور اسی کے مطابق دیوان صائبؔ میں ہے:

نشۂ رطل گراں از سنگ می یابیم ما   ہست در آزادی اطفال گل ریزان ما
تنگنائے شہر جائے نشۂ سرشار نیست   نشۂ دیگر دہد دو دامن صحرا شراب
(کلیات صائبؔ تبریزی مطبوعہ انتشارات کتاب فروشی خیام تہران)

◆◆◆

انتخابِ کلام

غزلیات ‘‘زرگل’’

(۱)

تمھیں یاد ہوگا وہ گزرا زمانہ   زبانوں پہ جب تھا فسانہ ہمارا
ہم آہنگ و ہمراز تھے ایسے ہم تم   نوا سنج ہوتا ہے جیسے دوتارا
وہ در پردہ سوزش وہ تمکیں بظاہر   چٹانوں میں پنہاں ہو جیسے شرارا
ستاروں نے دیکھا ہے راتوں کو اکثر   مرے نالۂ نیم شب کا نظارا
فلک سے گلہ ہے نہ تم سے شکایت   کوئی اور تھا جس نے واصف کو مارا

(۲)

وہ جلوہ طور پر جو دکھایا نہ جا سکا   آخر یہی ہوا کہ چھپایا نہ جا سکا
آتے ہی ان کے دشت و جبل مسکرا اٹھے   ایسے میں اپنا حال سنایا نہ جا سکا
گردوں بھی اضطراب عزیزاں سے ہل گیا   سوئے کچھ ایسے ہم کہ جگایا نہ جا سکا
دامن کے داغ اشک ندامت نے دھو دیئے   لیکن یہ دل کا داغ مٹایا نہ جا سکا
کتنی گھٹائیں آئیں برس کر گزر گئیں   شعلہ ہمارے دل کا بجھایا نہ جا سکا
باتیں ہزار یوں تو حریفوں کی چھپ گئیں   واصفؔ کا راز تھا جو چھپایا نہ جا سکا

(۳)

بزم مے سے نہ اٹھا مجھ کو مری جاں تھم جا   مجھ سا کون آیگا پھر صاحب عرفاں تھم جا
دل سے اک آہ جو کھینچوں تو سحر ہو جائے   مجھ کو آنکھیں نہ دکھا ظلمت زنداں تھم جا
انھیں ذروں سے دلِ تازہ بنانا ہے مجھے   دل کا مدفن ہے یہ اے شورش طوفاں تھم جا
دل لگی سے تری جز دل کوئی مانوس نہیں   ڈھونڈھ لوں دل کو نسیم سحرستاں تھم جا
دل کی کروٹ سے بگڑ جائے نہ نظم افلاک   دل میں کچھ اور ذرا دید کے ارماں تھم جا
ضبط کر واصفِؔ محزوں کہ نہیں تاب شنید   رحم کر بزم پہ اے جان عزیزاں تھم جا

(۴)

گرجتا گونجتا بادل سر کہسار آ پہنچا
اٹھو اے میکشو! وقت کشود کار آ پہنچا
جنون عشق کی عظمت زلیخا سے کوئی پوچھے
کہ یوسف سا پیمبر بھی سر بازار آ پہنچا
نہ دل میں یاد ماضی ہے نہ مستقبل کا اندیشہ
یہ کس منزل میں اے دل عمر کا رہوار آ پہنچا
خدا جانے کہ اب اہل نظر کا حال کیا ہوگا
تمنا جس کی تھی وہ لمحۂ دیدار آ پہنچا

(۵)

خطا کاروں کی عظمت زاہد معصوم کیا جانے
خطا کی اور زمیں کا بن کے آدمؑ تاجور آیا
گلستاں ایک دیوانے کی آمد سے چمک اٹھا
ہنسے غنچے کہ حسن بے نشاں کا پردہ در آیا
حضور حسن کیا معلوم دل پر کیا گزرتی ہے
کہ اس محفل سے جو آیا وہ ہوکر بے خبر آیا
مرے تار نفس کو چھیڑا اپنے تیر مژگاں سے
کہ میری خوئے غم سے زخمۂ غم بے اثر آیا
کہاں ہے رہروان دشت کی منزل خدا جانے
پلٹ کر راہرو آیا نہ کوئی راہبر آیا

(۶)

وہی تھا ایک لمحہ حاصل عمر رواں میرا
کھلا تھا ان پہ جب راز محبت ناگہاں میرا
بجز آہِ فسردہ کیا ہے اپنی شوق سامانی
حضور ساقی کوثرؐ یہی ہے ارمغاں میرا
نسیم صبح کے جھونکے سے سینہ چاک ہو جس کا
نہیں وہ غنچہ کم ظرف قلب رازداں میرا
سنا ہے گلشن ہستی میں پھر فصل بہار آئی
یہاں ابتک وہی دل ہے وہی سوز نہاں میرا
بس اک نخل تمنا ہی دلیل موسم گل ہے
یہی ہے سیرگہ میری یہی ہے گلستاں میرا
ابھی کچھ اور باقی ہیں ورق افسانۂ غم کے
کہ سرخی شفق ہے وقفہ عرض فغاں میرا
وہ نغمہ چھیڑ اے واصف کہ دل کو کچھ قرار آئے
زہے ساعت کہ آج آزاد ہے ہندوستاں میرا

(۷)

زمیں میری زماں میرا نظام آسماں میرا
جو ہے عزم ویقیں دل میں تو ہے سارا جہاں میرا
چمن کی وسعت رنگیں میں گو اب خاک اڑتی ہے
مگر اے ہم سخن پھر بھی یہیں ہے آشیاں میرا

ابھی کمسن ہو کیا میری وفا کو آزماؤ گے
یہاں مدت سے گردوں لے رہا ہے امتحاں میرا
نہ بڑھ حد ادب سے دور ہو اے دیو نومیدی
کہ تیری دسترس سے دور تر ہے آستاں میرا
نہ نکلی آج تک تعبیر گو خواب محبت کی
مگر اے دوست ! جائے گا نہ سودا رائگاں میرا
ترے نغموں میں واصف آج کیوں اتنی حرارت ہے
لہو بن کر نہ بہہ جائے یہ قلب ناتواں میرا

(۸)

قدم یوں بے خطر ہو کر نہ میخانے میں رکھ دینا
بہت مشکل ہے جان و دل کو نذرانے میں رکھ دینا
سنا ہے حضرت واعظ ادھر تشریف لائیں گے
ذار اس کاسۂ گردوں کو میخانے میں رکھ دینا
بتوں کے دل میں یوں شاید خدا کا خوف پیدا ہو
یہ میرے دل کے ٹکڑے جا کے بت خانے میں رکھ دینا
یہاں اے دل فرشتوں کا بھی زہرہ آب ہوتا ہے
قدم آساں نہیں الفت کے ویرانے میں رکھ دینا
چلا ہے گھر کو دیوانہ اڑا کر خاک صحرا کی
غبارِ خاطر احباب کاشانے میں رکھ دینا
زیارت کو وہ دشت نجد کا جانباز آئے گا
ذرا دم بھر کو میری نعش ویرانے میں رکھ دینا
بفیضِ حضرتِ ناصح ہوئی توفیق توبہ کی
مرا جامِ شکستہ ان کے شکرانے میں رکھ دینا
منافی تھا یہ اے منصور دستورِ امانت کے
کسی کی بات کو یوں اپنے بیگانے میں رکھ دینا

پلائی ہے جو واصفؔ کو مئے مرد آزما ساقی
تو کچھ شان خودی بھی اپنے دیوانے میں رکھ دینا

(۹)

کبھی درد آشنا تیرا بھی قلب شادماں ہوگا   کبھی نام خدا تو بھی تو اے کم سن جواں ہوگا
نہیں معلوم انکی جلوہ گہ میں کیا سماں ہوگا   نظر جب کامراں ہوگی تو اے دل تو کہاں ہوگا
وہی اک سانس ہمدوشِ حیات جاوداں ہوگا   جو آہِ سرد بن کر سوزِ غم کا ترجماں ہوگا
لرز جائیں گے یہ مظلومی دل کے تماشائی   اگر یہ خاک کا تودہ کبھی آتش فشاں ہوگا
جو سوزِ دل سے مضطر ہو کے آئیگا سرِ مژگاں   تو خورشید قیامت میرا اشک خونچکاں ہوگا
ستارے بنکے چمکیں گے دل برباد کے ذرے   یہ دل برباد ہو کر بھی دلیل کارواں ہوگا

(۱۰)

شرار شمع کو بے سوز پروانوں سے کیا ڈرنا
وقار حسن کو بے مغز دیوانوں سے کیا ڈرنا
تمھیں جیسے ہیں سب انسان انسانوں سے کیا ڈرنا
جو یہ حیوان بن جائیں تو حیوانوں سے کیا ڈرنا
جہاں موجیں ہی خود تکتی ہوں اٹھ اٹھ کر سوئے ساحل
تو پھر اے کشتی والو! ایسے طوفانوں سے کیا ڈرنا
تری موج نظر خود ہی بہار ہر دو عالم ہے
تو پھر اے باغباں اجڑے گلستانوں سے کیا ڈرنا
بقدر حوصلہ ہوتی ہے زخموں پر نمک پاشی
مذاق سوزش دل کو نمک دانوں سے کیا ڈرنا
بیابانہا بہر مشتے و صد منزل بہر گامے
جنوں کی عظمتوں کو ان بیابانوں سے کیا ڈرنا
لہو سے جس کے رنگیں سرخیٔ تاریخ عالم ہے
اسے بزم جہاں کے سرخ افسانوں سے کیا ڈرنا

جو پی کر ایک ہی جرعہ حواس و ہوش کھو بیٹھیں
بلا نوش ازل کو ایسے دیوانوں سے کیا ڈرنا
سناتے ہیں بڑی حکمت کی باتیں حضرت واعظ
جو خود کو بھول جائیں ایسے فرزانوں سے کیا ڈرنا

(۱۱)

کیا خوب ہے اس دورِ محبت کا فسانہ   جب عشق سے واقف وہ گل اندام ہوا تھا
ہر بوالہوس خام بھی اب اہل نظر ہے   فیضان ترا یوں نہ کبھی عام ہوا تھا
یوں راز تری بزم کے اِفشانہ ہوئے تھے   کب غیر کو یہ حوصلہ جام ہوا تھا

(۱۲)

کریں اپنے لئے ہم التجا کیا   سوالی بن کے پینے کا مزا کیا
گئی سوزش تو پھر دل میں رہا کیا   تپک جس میں نہ ہو وہ آبلہ کیا
جوانی بھی ہے اور حسن و ادا بھی   تجھے دوں اے ستمگر اب دعا کیا
اسی کوچے میں ساری عمر گزری   کوئی سمجھاؤ آخر ہے وفا کیا
خدائی کا یہ خود رکھتے ہیں دعوی   بتوں کے دل میں ہو خوفِ خدا کیا

(۱۳)

نگاہِ لطف کے قابل مجھے تم نے اگر جانا
تو کچھ مشکل نہیں بگڑے ہوئے دل کا سنور جانا
نہ کر تو رہنما کی فکر اے دل دشت غربت میں
مبارک ہو ترا ہر پھر کے منزل سے گزر جانا
بہا اے آنکھ سیل خون دل صحرائے وحشت میں
نہیں آساں نقوش عہد ماضی کا ابھر جانا
لڑکپن میں نہ سمجھے ہم کہ مرنا کس کو کہتے ہیں
جوانی نے بتایا موت سے پہلے ہی مر جانا

بگڑتا ہے یہاں ساحل تو آگے جا کے بنتا ہے
خلاف عزم ہے موجوں کی طغیانی سے ڈر جانا
پلک پر ان کی آنسو تاب عارض سے لرزتا ہے
کہ انگارے پہ ہے دشوار پارے کا ٹھہر جانا

(۱۴)

چھپایا یگانوں سے بھی رازِ الفت کہ یہ تھا بھرم درحقیقت تمھارا
مرے قلب مضطر کے رازِ نہاں کے امیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
محبت مری ایسی سستی نہیں ہے تمھیں چاہ کر پھر بھی چاہوں کسی کو
مرے دل کے گاہک مگر تم نہیں ہو نہیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
جو پردہ تمھارا ہے مضبوط ایسا تو میرا تجسس بھی بودا نہیں ہے
یہاں بھی وہاں بھی اِدھر بھی اُدھر بھی کہیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
ہمارے ہی دم سے ہے محفل کی رونق ہمیں سے ہیں زندہ رسوم محبت
اگر ہم نہ ہوں گے تو آخر اکیلے تمھیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
یہ واصف تمھارا وہی تو ہے جس نے تمھیں دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھا
حریم تصور میں تشریف لا کر مکیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا

(۱۵)

دل زار و محزوں کی گہرائیوں تک رسا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
مریض محبت کے درد جگر کی دوا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
بگڑنا تمھارا درست اور بجا ہے بڑی منتوں سے یہ موقع ملا ہے
ذرا اپنے غصے کے تیور دکھانا خفا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
سمجھتا ہوں میں بھی فلک کی نگاہیں ملے ہو تو آخر جدائی بھی ہوگی
تمھارے سوا کس کو اپنا بنایا جدا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہوگا
پیامی بنا کر تمھیں بھیجتا ہوں نہ تھمنا نہ رکنا کہیں میرے نالو!

یہ مانا کہ ہیں وہ بہت دور لیکن رسا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا
خدائی بہت سے خداؤں کی دیکھی مگر یہ سلیقہ کسی میں نہ پایا
یہ چھپنے کے انداز کب ہیں کسی میں خدا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا
کچھ ایسا ہے بیمار واصف تمھارا طبیبوں نے جس کا مداوا نہ پایا
نہ سمجھے کوئی جس کو ایسے مرض کی دوا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

(۱۶)

رسم جنونِ عشق کو توڑا نہ جائے گا ظالم یہ دین وہ ہے کہ چھوڑا نہ جائے گا
شیرازہ تیری بزم کا قائم اسی سے ہے عاشق کا دل نہ توڑ کہ جوڑا نہ جائے گا
کیونکر بنے گا باعث تنظیم میکدہ انگور کا جو خوشہ نچوڑا نہ جائے گا
آ ہم نشیں کہ داغ کہن تازہ کر چلیں یہ رخش عمر ہے اسے موڑا نہ جائے گا
کب سے ہوں زور بازو قاتل کا منتظر
واصف کا سر ہے سنگ سے پھوڑا نہ جائے گا

(۱۷)

خرمن دل جل چکا عرض تمنا کیا کروں دود آوارہ میں اڑ کر اک شرر چمکا تو کیا
گر گیا جب تیری نظروں سے تو دل کا کیا وقار خاک میں پامال ہونے پر گہر چمکا تو کیا
ہے بس اک تبدیل موسم تک صفائے آئینہ ظاہری زینت سے کوئی بے ہنر چمکا تو کیا

(۱۸)

کسی کے عشق کا یہ مستقل آزار کیا کہنا مبارک ہو دل محزوں ترا ایثار کیا کہنا
نہ کرتے التجا دیدار کی موسیٰ تو کیا کرتے چلا آتا ہے کب سے وعدۂ دیدار کیا کہنا
وہی کرتا ہوں جو کچھ لکھ چکے میرے مقدر میں مگر پھر بھی ہوں اپنے فعل کا مختار کیا کہنا
قدم اٹھتے ہی دل پر اک قیامت بیت جاتی ہے دم گلگشت اس کی شوخی رفتار کیا کہنا
شب ہجراں پہ میری رشک آتا ہے ستاروں کو بھرم تجھ سے ہے میرا دیدۂ بیدار کیا کہنا
ترے نغموں سے واصف اہل دل مسرور ہوتے ہیں بایں افسردگی رنگینیٔ گفتار کیا کہنا

(۱۹)

رخ اپنا بدل لیتا دریا کا دھارا مگر کاش تیرا سہارا تو ہوتا
مرے ڈوبتے دل کو ملتا کنارا ذرا تو نے دل کو ابھارا تو ہوتا
ادب کا ہے معلوم ہم کو قرینہ خلاف ادب تھا طلب کر کے پینا
اٹھا لیتے ہم بڑھ کے خود جام و مینا مگر تیرا کوئی اشارا تو ہوتا
مرا دل زمانے سے زیر و زبر ہے تجھے کیا بتاؤں یہ تیرا ہی گھر ہے
بڑے امن و راحت کا یہ مستقر ہے مرے دل کو تو نے سنوارا تو ہوتا
کھلا دل لگاتے ہی احوال الفت چھپائے سے چھپتی نہیں ہے محبت
مگر تم کو واصفؔ سے کیوں ہے شکایت بالآخر یہ راز آشکارا تو ہوتا

(۲۰)

لعل و گہر کا ہار بنایا ترے لئے
دل کو بھی ہم نے تار نظر میں پرو دیا
تیر نظر سے نکلے تو شاید نکل سکے
کانٹا جو غم نے میرے جگر میں چبھو دیا
وقت دعا جب آنکھ میں آنسو نہیں رہے
پلکوں کو میری خون جگر نے بھگو دیا
اہل قفس کو آتش گل کا تھا انتظار
شبنم نے آ کے سارے چمن کو بھگو دیا
دنیا نے کی نہ ایک دل بے مدعا کی قدر
واصفؔ کو اپنے ہاتھوں سے اپنوں نے کھو دیا

(۲۱)

بربادیٔ گلشن کا سماں یاد رہے گا
دیکھا ہے جو یہ عہد خزاں یاد رہے گا
بیچارگی دل کا سماں یاد رہے گا
یہ معرکۂ تیر و سناں یاد رہے گا
اس وعدۂ مبہم سے تسلی نہیں ہوتی
اک بار تو کہہ جاؤ کہ ہاں یاد رہے گا
دیکھے ہیں تماشے بہت اس عمر میں لیکن
رسوائیٔ واصفؔ کا سماں یاد رہے گا

(۲۲)

زیست کو پرکیف کرنے کا قرینہ آ گیا
موت سے آنکھیں ملا کر ہم کو جینا آ گیا
ہنس رہے تھے پھول میرے گریۂ معصوم پر
ناگہاں باد بہاری کو پسینہ آ گیا

آزمائش سے ہوا کرتی ہے تکمیلِ یقین   مژدہ باد اے دل کہ طوفاں میں سفینہ آ گیا
کیوں یکایک میرے پہلو سے اڑا جاتا ہے دل   دیکھنا اے چارہ سازو ! کیا مدینہ آ گیا
ہیں غنیمت زیست کے لمحے جو باقی ہیں ابھی
سر اٹھا واصف کہ عہدِ جام و مینا آ گیا

(۲۳)

وہ جن کی لو سے ہزاروں چراغ جلتے تھے   چراغ بادِ فنا نے بجھائے ہیں کیا کیا
نہ تاب دید نہ بے دیکھے چین ہی آئے   ہمارے حال پہ وہ مسکرائے ہیں کیا کیا
رضا و صبر و قناعت تواضع و تسلیم   فلک نے ہم کو خصائل سکھائے ہیں کیا کیا
لرز گیا ہے جہاں دستِ کاتبِ تقدیر   ہماری زیست میں لمحات آئے ہیں کیا کیا
نقاب اٹھاؤ تو قصہ ہی ختم ہو جائے   تمھارے پردہ نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
زمانہ ہلکا سا خاکہ نہ لے سکا جن کا   نقوش دست قضا نے مٹائے ہیں کیا کیا
یہ پنچ شیل یہ جمہوریت یہ رائے عوام   یہ اہل زر نے کھلونے بنائے ہیں کیا کیا
بلائے جاں ہوئی واصف کی بے گناہی بھی   ذرا سی بات میں الزام آئے ہیں کیا کیا

(۲۴)

یکا یک مرا دل تڑپنے لگا ہے مری عافیت پر کیا کس نے دھاوا
دکھا کر جھلک کون غائب ہوا ہے یہ برق طپاں تھی پری یا چھلاوا
جواب ان کا مدت سے آیا نہیں ہے دغا دے گیا طائر نامہ بر بھی
دکھاتا ہے اپنی جھلک آسماں پر مگر دور سے کاٹ جاتا ہے تاوا
جو بولے کبھی وہ تو آنکھیں دکھائے خفا ہو تو اپنوں کے دل کو چبائے
مگر اب تو ہم دل اُسے دے ہی آئے بایں خلق مذموم و گفتار یاوہ
یہ صحرائے وحشت بڑا پر خطر ہے قدم رکھ اگر دل میں تاب ضرر ہے
بھروسا نہ کر اس پہ جو ہم سفر ہے ہٹیں گے یہ سب تجھ کو دے کر بڑھاوا
عجب فتنہ ساقی نے شب کو اٹھایا بھری بزم میں میکشوں کو لڑایا
ادھر اک کو اکسا کے آگے بڑھایا ادھر سے دیا دوسرے کو چڑھاوا

یہ دنیا محبت کے قابل نہیں ہے یہاں دل لگانے کا حاصل نہیں ہے
نہ ٹھیرو! یہاں کوئی منزل نہیں ہے وہ ٹوٹے میں ہے جس نے کھولا کجاوہ
زمانے سے واصفؔ نگاہیں چرالو بہت ہے اگر اپنی عزت بچالو
کوئی بات ہرگز نہ مونھ سے نکالو کہ بگڑا ہوا ہے یہ آوے کا آوہ

(۲۵)

کیا کریں گے ترے دمساز مداوا تیرا
کیا ہے چارہ مرے دل غم کے علاوہ تیرا
کچھ شکستہ در و دیوار کچھ اجڑے سے چمن
کشور دل پہ ہے بے سود یہ دھاوا تیرا
ان رقیبوں کی شرارت سے ہوئے ہم پہ ستم
کیا اٹھائیں گے یہ محشر میں لداوا تیرا
شکوہ دوست نہیں اہل وفا کا شیوہ
کون ہے اس کے سوا ملجا و ماویٰ تیرا
تجھ سے کچھ بیر نہیں ہم کو مگر اے واعظ
کھل رہا ہے یہ تصنع یہ دکھاوا تیرا

(۲۶)

ناگہاں موج نظر سے آج دل ٹکرا گیا
مژدہ باد اے رہروِ طوفاں کہ ساحل آ گیا
ساغر دل کو وہ مست فتنہ گر چھلکا گیا
رخصت اے تمکیں کہ اشکوں میں تلاطم آ گیا
ہے خزاں بھی کیف آگیں دل اگر مسرور ہے
فصل گل بھی بے مزہ ہے دل اگر مرجھا گیا
با وفا ثابت ہوا اس بے مروت کا خیال
بے تکلف آ گیا خلوت میں دل بہلا گیا
کیا بہار اور کیا خزاں واصفؔ نظر کا کھیل ہے
لی جہاں انگڑائی دل نے موسم گل آ گیا

(۲۷)

باغ جہاں سے دل کو اکھیڑا نہ جا سکا
مر کر بھی پانوؤں کو سکیڑا نہ جا سکا
مدت سے آرزو تھی کہ وہ راہ میں ملے
بارے ملا تو راہ میں چھیڑا نہ جا سکا
مر مر کے زندہ ہوتے ہیں وابستگان عشق
ہنگامہ عاشقی کا نبیڑا نہ جا سکا

(۲۸)

(ترجمہ غزل صائبؔ)

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تم جب تھے باہم آشنا
ہم جلیس و ہم صفیر و ہم خیال و ہم نوا
اتحاد و ربط میں اک شعر کے معنی تھے ہم
گو الگ دو مصرعوں کی طرح تھے ہم ظاہرا

صورت خامہ ہماری بات بھی ہوتی تھی ایک   گو بظاہر دیکھنے میں دو زبانیں تھیں جدا
جیسے وہ دو پتیاں جو ایک دانے سے اگیں   یکدلی سے ہم نے پائی ساتھ ہی نشو و نما
اختر قسمت تھا روشن تھی مبارک زندگی   سایہ افگن ہم پہ تھا یمن و سعادت کا ہما
دوریٔ منزل ہمارے ربط میں حائل نہ تھی   ہم جہاں ہوتے خبر آپس میں رکھتے تھے صدا
چارہ گر کو ہم نے اے صائبؔ کبھی زحمت نہ دی   خود ہی بن جاتے تھے ہم دکھ درد کی اپنے دوا
اہل دل نے کر لیا محسوس میرا سوز و ساز
جو کہا صائبؔ نے وہ واصفؔ کے دل کی ہے صدا

(۲۹)

وہ جسکی جستجوئے دید میں پتھرا گئیں آنکھیں   نظر کے سامنے اک دن سر محفل بھی آئیگا
یہ کیا شکوہ کہ کوئی چاہنے والا نہیں ملتا   کرم پر تم جو ہو مائل کوئی سائل بھی آئیگا
یہ طوفاں خیز موجیں یہ تھپیڑے باد و باراں کے   سفینے کو یونہیں کھیتے رہو ساحل بھی آئے گا
نہ ہو مایوس ہمدم پاؤں میں لغزش نہ آ جائے   نظر کچھ دور چل کر جادۂ منزل بھی آئے گا
محبت اپنے دیوانوں کو ویراں رکھ نہیں سکتی   کسی کی جستجو میں ایک دن محمل بھی آئے گا
یہ محفل آج نا اہلوں سے جو معمور ہے واصفؔ
اسی محفل میں کوئی جوہر قابل بھی آئے گا

(۳۰)

تری نگاہ سے کیا کیا ہوا ہے دل رقصاں   وہ گویا برق کی رو تھی یہ جیسے پارہ تھا
خدا ہی جانے مراحل یہ طے ہوئے کیونکر   تمھارا نام ہی دل کا مرے سہارا تھا
قفس سے حسرت تعمیر لے کے نکلے ہم   بڑا زمانہ اسی فکر میں گزارا تھا
کمال سنگدلی سے بجھا دیا تم نے   دلوں میں عزم محبت کا جو شرارا تھا
ذرا سی دیر میں تم نے کیا چمن کو خراب   ہمارے شوق نے برسوں جسے سنوارا تھا
یہ کس مجاہد الفت کا تم نے خون کیا   گناہگار تھا واصفؔ مگر تمھارا تھا

(۳۱)

اگر خوئے تحمل ہو تو کوئی غم نہیں ہوتا   گلے شکوے سے رنج زندگی کچھ کم نہیں ہوتا

بجھی جاتی ہیں شمعیں رہ گزار زندگانی کی
چراغ آرزو لیکن کبھی مدھم نہیں ہوتا
خدا کے سامنے جو سر یقیں کیساتھ جھک جائے
کسی طاقت کے آگے پھر کبھی وہ خم نہیں ہوتا
عطا کی ہے خدا نے علم کی دولت اگر تجھ کو
سخاوت کر سخاوت یہ خزانہ کم نہیں ہوتا
سیاست جزو ایماں ہے چلو یونہی سہی لیکن
کوئی مرشد مزاج وقت کا محرم نہیں ہوتا
عروج پیکر خاکی سے ہے انسانیت لرزاں
فساد و سرکشی سے پاک یہ عالم نہیں ہوتا
سنو آزادیٔ انساں کا ڈھونسا پیٹنے والو!
ہر اک انسان وجہ عظمت آدم نہیں ہوتا
بقدر ظرف و ہمت ہے رسائی فکر انساں کی
ہر اک عامی رموز ملک کا محرم نہیں ہوتا

(۳۲)

مرے دل پہ اک کوہ اندوہ و غم ہے اگر جان لیتا وہ دلدار اتنا
پسند اس کے دل کو بھی شاید نہ ہوتا مری جان مجبور پر بار اتنا
ستم تم نے کوئی نہ رکھا اٹھا کر مگر مجھ کو تم سے نہیں کوئی رنجش
ذرا میں بھی دیکھوں زمانے میں کوئی اگر ہو تمھارا وفا دار اتنا
بتوں کی خدائی بھی تسلیم کر لی مگر صنع خالق کا انکار مشکل
تمھارا حرج کیا ہے اے رہنماؤ! جو رہ جائے ایمان و اقرار اتنا
نہ اٹھے مرا سر جو قدموں پہ رکھدوں نہ ہو کچھ غرض مجھ کو پھر دو جہاں سے
تمنا ہے کب سے یہی میرے دل میں میسر ہو بس مجھ کو دیدار اتنا
یہ دنیا ہے بے فیض و خود کام واصفؔ یہ مانا کہ وحشت میں ہے عافیت بھی
مناسب نہیں ہے مگر آدمی کو کہ ہو جائے خلقت سے بیزار اتنا

(۳۳)

قلب بریاں دیدۂ حیران لے کر ہی گیا
مغفرت کا اپنی میں سامان لے کر ہی گیا
جائے محرومی نہیں اے حاضران بارگاہ
جو بھی آیا عفو کا فرمان لے کر ہی گیا
آج رخصت ہو گیا دنیا سے اک بیمار غم
درد ایسا دل میں اٹھا جان لے کر ہی گیا
غم یہاں کا یا وہاں کا اپنا اپنا ہے نصیب
کچھ نہ کچھ دنیا سے غم انسان لے کر ہی گیا
حسن صنعت پر رہی عشق بتاں میں بھی نظر
میں سلامت اپنا کچھ ایمان لے کر ہی گیا

اللہ اللہ کس قدر محکم رہا تیرا حجاب
تیرا واصفؔ دید کا ارمان لے کر ہی گیا

(۳۴)

ہر قدم پر میرے سجدے کا نشاں بنتا گیا
اسکا ہر نقش کف پا جاوداں بنتا گیا
کیا گلہ ہے آسماں سے اے شہیدان ستم
کچھ دھوئیں اٹھتے گئے اور آسماں بنتا گیا
تھی خرابی میں ہی پوشیدہ مری تعمیر بھی
بجلیاں گرتی گئیں اور آشیاں بنتا گیا
بارہا میری لحد کی خاک اڑائی دہر نے
دل کے ہر ذرے سے اک تازہ جہاں بنتا گیا
آتش گل اشک شبنم داغ لالہ دود آہ
متحد ہوتے گئے اور گلستاں بنتا گیا
کیا ہی مردم خیز تھی خاک جہان آباد بھی
جو فنا ہوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا
واصفؔ افسردہ دل کی خوشنوائی اب کہاں
جس قدر ٹوٹے مصائب بے زباں بنتا گیا

(۳۵)

رخصت ہوئے ارباب وفا چھٹ گیا میلا
میں رہ گیا تلوار کی مانند اکیلا
بدلی سی نظر آتی ہیں قاصد کی نگاہیں
لو اور لگا جان کو میری یہ جھمیلا
ہیں اہل نظر کے لئے قدرت کی یہ آیات
چنپا ہے چنبیلی ہے کہیں موتیا بیلا
امید کرم سفلۂ زردار سے بے سود
کیوں تلخ نہ ہو نیم چڑھا ہو جو کریلا
واصفؔ یہی اجڑا سا چمن میرا وطن ہے
چلنا یہیں سیکھا ہے اسی خاک میں کھیلا

(۳۶)

بیمار غم کچھ ایسا یکایک بکھر گیا
سب رو دیئے طبیب کا چہرہ اتر گیا
کب تک میں ناخدا کے سہارے جیا کروں
پانی تو اے خدا مرے سر سے گزر گیا
باقی ہے کتنا اہل وفا کا اب امتحاں
مدت ہوئی ستم کا سفینہ تو بھر گیا
بیشک وہ راست باز ہے لیکن ہمارے ساتھ
اکثر یہی ہوا کہ کہا اور مکر گیا
کیا پوچھتے ہو منزل محبوبۂ بہار
جھونکا تھا اک صبا کا چمن سے گزر گیا
واصف کو اہل دہر نے کیا کیا کیا ذلیل
لیکن جو کام تھا اسے کرنا وہ کر گیا

(۳۷)

مرے سر پھوڑنے کو موج بوئے گل ہی کافی ہے
نہیں جوش جنوں وابستۂ دیوار و در اپنا
بتاؤں کیا تجھے واصف کہاں ہوں کسطرح ہوں میں
نہیں ملتا نشاں خود مجھ کو تا حد نظر اپنا

(۳۸)

افسانہ محبت انجام تک نہ پہنچا   محفل میں انکی میرا پیغام تک نہ پہنچا
دن چلتے چلتے گزرا بیتے گی رات کیونکر   منزل پہ یہ مسافر گر شام تک نہ پہنچا
آغاز زندگی سے جھیلا غم محبت   بعد فنا بھی واصفؔ انجام تک نہ پہنچا

(۳۹)

سر محفل نقاب رخ اٹھایا جا نہیں سکتا   تماشا دل کا آنکھوں کو دکھایا جا نہیں سکتا
یہ آغازِ جوانی ہے یہ انجام محبت ہے   کہ سر زانو سے اب پہروں اٹھایا جا نہیں سکتا
یہ مانا صفحۂ ہستی سے تم مجھ کو مٹا دو گے   مگر یہ داغ رسوائی مٹایا جا نہیں سکتا
ہوائے منزل لیلیٰ نے بیخود کر دیا اتنا   قدم بھی اب سوئے منزل اٹھایا جا نہیں سکتا
چھپایا عمر بھر جس راز کو وہ آج کھلتا ہے
کہ بار زیست اب واصفؔ اٹھایا جا نہیں سکتا

(۴۰)

تجھ پہ نثار چشم و دل رخ سے نقاب اٹھائے جا
آنکھ پہ بھی نگاہ رکھ دل کو بھی آزمائے جا
دل کہیں میرا بجھ نہ جائے دل کو مرے جلائے جا
بجھ گیا دل تو زیست کیا یونہیں مجھے جلائے جا
تلخ سے تلخ لائے جا جام و سبو لنڈھائے جا
میں تجھے آزما چکا تو مجھے آزمائے جا
زیست سے بڑھ کے اور کیا زیست میں ہوگا امتحاں

جتنا بھی تجھ سے ہو سکے یونہیں مجھے ستائے جا
غم سے جو آشنا نہ ہو جینے کا اس کو حق نہیں
چاہے جو لطف زندگی سختی غم اٹھائے جا
دیکھ یہ راہ عشق ہے آئے نہ چہرے پر شکن
کانٹے چبھیں تو غم نہ کر آگے قدم بڑھائے جا
واصفؔ مضطرب انھیں رہنے بھی دے حجاب میں
بزم خیال میں مگر شمع وفا جلائے جا

(۴۱)

کس طرح غم کو چھپائے دل آزار طلب　　سر مژگاں کوئی منصور ہے پھر دار طلب
کفر و ایمان کی تفریق ہے دشوار طلب　　ہے یہاں دانۂ تسبیح بھی زُنار طلب
شرم رکھ لے مری بیچارگی و حسرت کی　　میں نے تجھ سے ہی کیا ہے تجھے ناچار طلب
آزمائش گہ غم میں دل نازک کو نہ لا　　کہ زر گل نہیں ہویا کبھی معیار طلب
ہے گنہ گار مگر/ تیرا گدا ہے واصفؔ
تیرا دامانِ شفاعت ہے گنہگار طلب

(۴۲)

ہیں فرشتے جس کی عظمت کے گواہ　　ہے وہی انساں ذلیل و خوار اب
ہم نہ کہتے تھے کہ یوں ان کو نہ دیکھ　　خوب رو اے دیدۂ خونبار اب
ماجرائے ضبط واصفؔ کچھ نہ پوچھ　　مضمحل ہے طاقت گفتار اب

(۴۳)

اعراض و برہمی ہے اُدھر اس طرف نیاز　　کیونکر چھپی رہے سر محفل کسی کی بات
باقی ہے کوئی وار تو حاضر دل و جگر　　ہے اور میرے دوست مری زندگی کی بات
صحن چمن میں روئی ہے شبنم بھی رات بھر　　پہنچی ہے کتنی دور مری بیکسی کی بات
واصفؔ گئے جہان سے ارباب آگہی　　اب جائیں کس سے پوچھنے ہم آگہی کی بات

(۴۴)

اے وہ کہ اقتدار نے تجھ کو کیا ہے مست   کیا یاد اب نہیں ہے تجھے وعدۂ الست
رکھتا ہے تو زبان پہ جاری خدا کا نام   دیکھا جو غور سے تو بباطن ہے خود پرست
کوتاہ کس قدر ہے یہ ملک عدم کی راہ   مژگاں کی اک جھپک ہے نفس کی بس ایک جست
ہاں تیرے ہاتھ بک نہیں سکتا مرا ضمیر   قسمت نے گرچہ مجھ کو بنایا ہے تنگ دست
آتا نہیں سمجھ میں ترا مدعا ہے کیا   بندے کے ہاتھ میں نہیں قسمت کا بندوبست

غافل مباش از دل یاس آشنائے من
ایں قطرہ از گداز دو عالم چکیدہ است (بیدلؔ)

(۴۵)

کہتے ہیں سر راہ مناسب نہیں ملنا   کیا خوب کہ اب ہوگی کہیں اور ملاقات
ہلکی سی خلش دل میں نگاہوں میں اداسی   شاید یونہیں ہوتی ہے محبت کی شروعات
ٹوٹے ہوئے تارے میں نہیں کوئی تجلی   پلکوں سے گرا اشک تو کیا رہ گئی اوقات
ہم نے بھی اٹھائی ہے بہت آج خرابی   واصف کو بلاؤ کہ چلیں سوئے خرابات

(۴۶)

مجھ کو یہ رنج کہ کب تک سہوں ان کی بیداد   ان کو شکوہ کہ ستم پر مرے کیوں ہے فریاد
آہ کچھ ایسا مرے دل کو اجاڑا تم نے   جیسے دلّی کو زمانے نے کیا تھا برباد
میری غیرت پہ کوئی حرف نہ آئے یارب!   ہے ادھر تاک میں بجلی تو ادھر ہے صیاد
دل مرا فتنۂ حاضر سے گھٹا جاتا ہے   آج انساں ہے ہر اک بند حیا سے آزاد
سوچتا ہوں کہ بایں لغزش پائے آدم   دوش پر کس کے ہے قائم فلک بے بنیاد
زندگی خود ہے یہاں ایک مسلسل عصیاں   کب تک امید میں جنت کی جئیں گے زُہّاد

صورتِ موجِ صبا قطعِ سفر کر واصفؔ
تیری منزل نہیں یہ کارگہ کون و فساد

(۴۷)

ترے غم میں عمر گزر گئی مری روح آئی نکھار پر
مجھے دیکھنا ہو تو جلد آ کہ چلا میں دوش بہار پر
مری کامیاب نگاہ بھی مرے شوق کو نہ پہنچ سکی
مری روح محو جمال تھی جو نظر گئی رخ یار پر
کبھی پست ہوں کبھی اوج پر کبھی ہست ہوں کبھی بے نشاں
یہ ہجوم عشوۂ کن فکاں مری ایک مشت غبار پر
مری ناتوانی و خستگی مرے عزم کو نہ دبا سکی
تری راہ میں جو تھکا ہوں میں تو اڑا ہوں دوش غبار پر
یہ نصیب واصفؔ زار کا کہ اسی کا بندہ عشق ہے
جو خدا سے بھی نہ ڈرے کبھی نہ ہو مہرباں دل زار پر

(۴۸)

کھلنے ہی لگے ان پر اسرارِ شباب آخر
آنے ہی لگا ہم سے اب ان کو حجاب آخر
تعمیل کتاب اول تاویل کتاب آخر
تدبیر و عمل اول تقریر و خطاب آخر
اس خاک کے پتلے کی کیا خوب کہانی ہے
مسجود ملک اول رسواؤ خراب آخر
گو خود وہ نہیں کرتے بخشش میں حساب اول
دینا ہے مگر ہم کو اک روز حساب آخر
دیدار سے پہلے ہی کیا حال ہوا دل کا
کیا ہوگا جو الٹیں گے وہ رخ سے نقاب آخر
محروم نہ رہ جانا کوتاہیٔ ہمت سے
ہونے کو ہے اے واصفؔ یہ بزم شراب آخر

(۴۹)

بدل ڈالو مری تقدیر کو مجھ سے خفا ہو کر
کہ تم جو بد دعا دیتے ہو لگتی ہے دعا ہو کر
اسی کوچے سے وابستہ ہے موت و زندگی اپنی
کہاں جائیں گے مرنے کے لیے تم پر فدا ہو کر
خدایا تیرے گلشن پر یہ آفت کیسی آئی ہے
بتوں نے آہ! کیا کیا گل کھلائے ہیں خدا ہو کر

وہ اک خاموش سجدہ آ سکھا دوں تجھ کو اے زاہد
قبول خاطر والا جو ہو جائے ادا ہو کر
جہاد حریت کا آہ! یہ انجام ہے واصفؔ
کہ پہنچے ہم سر منزل مگر بے دست و پا ہو کر

(۵۰)

ہم سفر دور گئے بادیہ پیما ہو کر
رہ گئے راہ میں ہم نقش کف پا ہو کر
قیس اچھا رہا آوارۂ صحرا ہو کر
ہم کہیں کے نہ رہے شہر میں رسوا ہو کر
زندگانی کے ہر اک لمحے کو نعمت جانو
خواہ جینا پڑے ناکام تمنا ہو کر
وقت ہے ایسے میں آ کر مرے آنسو پونچھو
کیا کرو گے جو رواں ہونگے یہ دریا ہو کر
دل پہ جو حادثہ گزرا ہے اسے کیا کہیے
کیا قیامت ابھی اور آئے گی برپا ہو کر
نہ گئی اپنے مقدر کی سیاہی واصفؔ
ان کے دل میں جو رہے ہم تو سویدا ہو کر

(۵۱)

وہ نغمہ و شراب نہ وہ عالم نشاط
اب کیا ہے لطف زیست کہ تہ ہو چکی بساط
رخ پر کبھی جو ان کے مچلتا ہے انبساط
دشوار کتنی ہوتی ہے اس وقت احتیاط
پیتے ہیں ہم تو اشک بڑے اہتمام سے
دل کا معاملہ ہے کہاں تک ہو احتیاط
انساں ہے آج راہ ترقی پہ گامزن
انسانیت کا رخ ہے مگر سوئے انحطاط
قطرے کی ماہیت کو سمندر سے پوچھیے
کوئی محیط ہے نہ یہاں ہے کوئی محاط
کتنا ہی مجھ کو پست کیا روزگار نے
لیکن نہ آیا میرے عزائم میں انحطاط
راہ فنا کے ہم تو مسافر ہیں دوستو!
قائم ہمارا ربط نہ دائم ہے یہ رباط
واصفؔ یہ آرزو ہے کروں عرض مدعا
بکھرے ہوئے لغات کو دیتا ہوں انضباط

(۵۲)

یقیں بڑھتا رہا لمحہ بہ لمحہ
ترے وعدے نے تڑپایا سحر تک
وفا کی منزلیں کتنی کٹھن تھیں
بچھڑ کر رہ گئے سب ہم سفر تک

کیا تھا شوق آزادی نے بیخود   نہ تھی انجام کی ہم کو خبر تک
کہیں کیا ماجرا سود و زیاں کا   لٹا سرمایۂ فکر و نظر تک
کرشمہ ہے یہ عالی ہمتی کا   یہ مشت خاک جا پہنچا قمر تک
ستم کب تک تمہارے چھپ سکیں گے   کہ فریادی ہیں یہ دیوار و در تک

(۵۳)

نہیں معلوم کتنے ہو چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر تیرے وفاداروں کی ہمت ہے جواں اب تک
یہ طوفان حوادث اور تلاطم باد و باراں کے
محبت کے سہارے کشتیٔ دل ہے رواں اب تک
کہاں چھوڑا ہے دل کو کاروان آہ و نالہ نے
کہ ہے آوارہ منزل یوسف بے کارواں اب تک
تلاش بحر میں قطرے نے کتنی ٹھوکریں کھائیں
سمجھ لیتا جو خود کو بن ہی جاتا بے کراں اب تک
دلِ بیمار کو ہمدم! ہوائے سیرِ گل کیا ہو
کہ ہے نامعتدل آب و ہوائے گلستاں اب تک
ازل سے گوش دل میں گونجتے ہیں زمزمے تیرے
مگر اے دوست میں نے تجھ کو پایا بے نشاں اب تک
عیاں افسردگیٔ گل سے ہے انجام گلشن کا
مگر خون دل بلبل ہے صرف آشیاں اب تک

(۵۴)

ذرہ حریف مہر درخشاں ہے آج کل   قطرے کے دل میں شورش طوفاں ہے آجکل
صد جلوہ بے حجاب خراماں ہے آج کل   سہما ہوا سا گنبد گرداں ہے آج کل
آنسو میں عکسِ نقشہ دوراں ہے آج کل   سمٹا ہوا سا عالم امکاں ہے آج کل

برہم مزاج فطرت انساں ہے آج کل   کس مخمصے میں غیرت یزداں ہے آج کل
قسمت کی تیرگی کی کہانی نہ پوچھیے   صبح وطن بھی شام غریباں ہے آج کل
شیرازۂ امید شکستہ ہے ان دنوں   جمعیت خیال پریشاں ہے آج کل
ہے اک نگاہِ مہر کی واصفؔ کو آرزو
واصف کا دل شکستہ و ویراں ہے آج کل

(۵۵)

دل پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے سہے جاتا ہے دل   آہ کرنا چاہتا ہوں میں تو تھراتا ہے دل
کانپتا ہے مضطرب ہوتا ہے گھبراتا ہے دل   پھر بھی کیا کیا تلخیاں الفت میں پی جاتا ہے دل
کیا خبر کیا حال ہو غم سے جو مل جائے نجات   عافیت کے نام سے بھی اب تو گھبراتا ہے دل
بے طلب جتنا ملا بس میرے لائق تھا وہی   ہاتھ پھیلانے سے اب انکار فرماتا ہے دل
دیکھتے ہی دیکھتے پہلو سے جاتا ہے نکل   شوق میں اپنے مجھے برباد کر جاتا ہے دل
دیکھ کر دنیا کو اپنے غم سے ہم فارغ ہوئے   اب تو غیروں کی مصیبت پر بھر آتا ہے دل
تیرے اعدا کیا کہیں گے دیکھ کر یارب مجھے   آج محرومی پہ اپنی آپ شرماتا ہے دل
دل سے وابستہ تھے میرے دل کے سارے حوصلے   دیکھ کر سامان جلوہ مجھ کو یاد آتا ہے دل
جانتا ہوں اس کی رحمت کا نہیں کوئی شمار   لیکن اسکی بے نیازی سے بجھا جاتا ہے دل
غم ستاتا ہے تو کر لیتا ہوں میں فکر سخن
کچھ نہیں واصفؔ تو دم بھر کو بہل جاتا ہے دل

(۵٦)

کیا پوچھتے ہو ہم سے کہاں کے ہیں مکیں ہم   سمجھو گے جہاں تم ہمیں رہتے ہیں وہیں ہم
پامال ہیں گو خاک سے کمتر بھی نہیں ہم   پہنچے ہیں کسی وقت سر عرش بریں ہم
دل ہے کہیں اور جان کہیں اور کہیں ہم   کیا ڈھونڈتے ہو ہمکو جہاں میں کہ نہیں ہم
چھوٹی نہ تری راہ گزر بعد فنا بھی   رکھنا قدم آہستہ کہ ہیں زیر زمیں ہم
ایمان نہ لائیں گے کبھی چھوڑ کے تجھ کو   بالفرض کہیں دیکھ بھی لیں تجھ سا حسیں ہم
باقی ہے بس اب دل میں یہی ایک تمنا   بھولیں نہ ترا نام دم باز واپسیں ہم

ارباب وفا دہر سے رخصت ہوئے واصفؔ
دکھ سہنے کو باقی رہے آخر میں ہمیں ہم

(۵۷)

بجھتے ہوئے چراغ فروزاں کریں گے ہم
تم آؤ گے تو جشن چراغاں کریں گے ہم

باقی ہے خاکِ کوئے محبت کی تشنگی
اپنے لہو کو اور بھی ارزاں کریں گے ہم

بیچارگی کے ہو گئے یہ چارہ گر شکار
اب خود ہی اپنے درد کا درماں کریں گے ہم

جوشِ جنوں سے جامۂ ہستی ہے تار تار
کیونکر علاجِ تنگیٔ داماں کریں گے ہم

اے چارہ ساز دل کی لگی کا ہے کیا علاج
کہنے سے تیرے سیر گلستاں کریں گے ہم

کیا غم جو حسرتوں کے دیے بجھ گئے تمام
داغوں سے آج گھر میں چراغاں کرینگے ہم

واصفؔ کا انتظار ہے تھم جاؤ دوستو!
دم بھر میں طے حدودِ بیاباں کریں گے ہم

(۵۸)

آسمانوں سے ستارے توڑ کر لاتا ہوں میں
تیری بزم ناز میں کس شان سے آتا ہوں میں

جستجو میں تیری کچھ ایسا مزہ پاتا ہوں میں
راہ پا کر خود کسی جانب بھٹک جاتا ہوں میں

کیا بتاؤں کب سے جاری ہے یہ دستور خطا
تیرے اندازِ کرم پر ناز فرماتا ہوں میں

جھوم جاتا ہے ہر اک گلبن ریاضِ دہر کا
لڑکھڑا کر جام سے جب بادہ چھلکاتا ہوں میں

ہوں نشانِ راہ لیکن بے خبر منزل سے ہوں
راہبر ہوں پھر بھی تجھ کو بے نشاں پاتا ہوں میں

تھا ارادہ خوب لوٹوں گا مزے جلووں کے آج
لوٹنے آیا تھا لیکن خود لٹا جاتا ہوں میں

(۵۹)

وہ عیادت کو مرے گھر پر سنا ہے آئیں گے
رخصت اے دشت جنوں گھر ڈھونڈھنے جاتا ہوں میں

وہ نگاہ ناز ہوتی ہے جو گرم التفات
جھوم کر واصفؔ فضاؤں میں سما جاتا ہوں میں

(۶۰)

کیا کوئی سیارہ ٹکرایا ہے میری آہ سے
آسماں پر سیکڑوں شمعیں فروزاں ہو گئیں
ہو گیا پامال اپنا جذبۂ فکر و عمل
دل کی ساری قوتیں مصروفِ طوفاں ہوگئیں
یاس و حرماں نے کیا پابندِ تسلیم و رضا
میری کافر حسرتیں آخر مسلماں ہو گئیں
ہو چلا تھا انس مجھ کو اضطرابِ بحر سے
موج کی اٹھکھیلیاں بھی نذرِ طوفاں ہوگئیں
دیکھنا مضرابِ غم سے کسنے اب چھیڑا ہے ساز
کشتگانِ عشق کی روحیں غزل خواں ہوگئیں
جلوہ افگن تھیں یہاں کیا کیا مبارک ہستیاں
دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے پنہاں ہوگئیں
اب کہاں واصفؔ ملیں گی وہ گزشتہ صحبتیں
اب وہ باتیں سربسر خوابِ پریشان ہوگئیں

(۶۱)

وفا کا رشتہ سب احباب واخواں توڑ دیتے ہیں
بگڑتی ہے تو سارے عہد و پیماں توڑ دیتے ہیں
ذرا سوچا تو ہوتا اے مرا دل توڑنے والے
کہیں مہمان بن کر گھر کا ساماں توڑ دیتے ہیں
تجھے لازم ہے گل چیں پاس آداب تماشا بھی
وہ ناداں ہیں جو دستورِ گلستاں توڑ دیتے ہیں
دلیلِ کامرانی ٹوٹ جانا ہے سہاروں کا
کہ خود اپنا سفینہ اہل ایماں توڑ دیتے ہیں
نہ ہنس ان پا شکستہ خستگانِ راہ الفت پر
انھیں قدموں سے یہ حدِ بیاباں توڑ دیتے ہیں
پلا دیتے ہو تم جن میکشوں کو اپنی آنکھوں سے
وہ اپنے عزم سے دیوارِ زنداں توڑ دیتے ہیں
ڈرو! اے دوستو! واصفؔ کے نالوں کی رسائی سے
کہ یہ نالے حدودِ چرخ گرداں توڑ دیتے ہیں

(۶۲)

بیگانۂ خلش کا یہاں کچھ بھرم نہیں   مطرود بارگاہ ہے جس دل میں غم نہیں
پاسِ وفا خیالِ کرم قصدِ التفات   سب کچھ ہے تیرے دل میں مگر ایک ہم نہیں
تیری نگاہِ خاص نے اتنا کیا بلند   دل مبتلائے وہمِ حدوث و قِدم نہیں
کچھ بوالہوس کا خوف تو کچھ شرمِ اہل دل   کیا لطف حسن و عشق جو محفل میں ہم نہیں
واصفؔ کی زندگی تو ہے ویراں ترے بغیر   اب تو وطن بھی گوشۂ غربت سے کم نہیں

(۶۳)

تجھے بھی روٹھ کے آخر رلاؤں گا اک دن   میں خلوتوں میں تجھے یاد آؤں گا اک دن
جبیں میں نور نگاہوں میں کائنات لیے   مجھے تلاش کروگے نہ پاؤں گا اک دن
نئی ادا سے ابھاروں گا جذبۂ دل کو   جہان عشق کو باغی بناؤں گا اک دن
فضائے خلد سے رحمت کی بارشیں ہوں گی   بہار رفتہ کو گلشن میں لاؤں گا اک دن
نہیں ہے وحشت دل کو یہ خاکداں کافی   میں اسکی عرش سے سرحد ملاؤں گا اک دن
ورائے وہم و گماں حد ہوش سے آگے   یقین و وجد کی بستی بساؤں گا اک دن
ریاض دہر کا ہر پھول سر جھکا دے گا   سر نیاز جو اپنا اٹھاؤں گا اک دن
گماں سے دور نظر سے نہاں یقیں سے بعید   تجھے بھی بزم میں اپنی بلاؤں گا اک دن

نظر کا دھوکا ہے واصفؔ نظام بود و نبود
نقابِ عارضِ فطرت اٹھاؤں گا اک دن

(۶۴)

دل کو جرم عشق سے پھر آشنا کرتا ہوں میں   اسکی رحمت آزماتا ہوں خطا کرتا ہوں میں
ساتھ کیا دے گی رہِ الفت میں عقل نارسا   ہر قدم پر اپنے دل کو رہنما کرتا ہوں میں
اس کو اپنے ظلم پر واصفؔ حیا آتی نہیں   مجھ کو شرم آتی ہے جب ذکر جفا کرتا ہوں میں

(۶۵)

مجھے نہ ترک محبت پہ کیجئے مجبور   کہ اپنے دل پہ مجھے کوئی اختیار نہیں
تمھارے وعدۂ فردا کا اعتبار تو ہے   مگر حیاتِ دو روزہ کا اعتبار نہیں

مجھے تو ہوش و خرد نے تھکا دیا ساقی   پلا پلا مجھے یارائے انتظار نہیں
تری نظر نے کچھ ایسا کرم کیا مجھ پر   خزاں کا خوف نہیں حسرتِ بہار نہیں
اجڑ گیا ہے جو آصف کا دل تو کیا غم ہے   کہ دل پہ سوزِ محبت کا انحصار نہیں

(٦٦)

اب عیش کی خواہش نہ مسرت کا ہے ارمان   دلّی کی طرح دل بھی مرا ہو گیا ویران
کیا ہاتھ پسارے گا وہ بیگانوں کے آگے   اپنوں کا بھی جس نے نہ اٹھایا کبھی احسان
خطرے ہی میں رہتے ہیں غریبان محبت   بچتی ہے اگر جان تو لٹ جاتا ہے ایمان

(٦٧)

آجاؤ بے خطر کسی بیکس کی نعش پر   کس کا قتیل ہے یہ کسی کو خبر نہیں
مضراب غم سے تار نفس نغمہ ریز ہے   جب تک یہ زندگی ہے الم سے مفر نہیں
اے میری حسرتو! ابھی سو جاؤ رات ہے   یہ آہ کی چمک ہے نمود سحر نہیں
کردار اگر نہیں ہے تو گفتار بے اثر   بسیار گو کی بات کبھی معتبر نہیں

(٦٨)

گردش چشم ناز کیا جانیں   میکشی پاکباز کیا جانیں
مے کی وجہ جواز کیا جانیں   یہ ہنر پاکباز کیا جانیں
آنسوؤں سے وضو نہ ہو جن کا   وہ طریق نماز کیا جانیں
جان دیتے ہیں پل میں پروانے   رات بھر کا گداز کیا جانیں
ہر تکلف سے بے نیاز ہے عشق   ہم حدودِ نیاز کیا جانیں
موت سے کشمکش نہ ہو جن کی   زندگی کا وہ راز کیا جانیں
قصۂ نجد و ماجرائے یمن   ساکنان حجاز کیا جانیں
درد ہی دل کی ہے دوا آصف
یہ دوا چارہ ساز کیا جانیں

(٦٩)

جو رزق بے حساب خدا نے عطا کیا   بندوں سے لینگے حشر میں اسکا حساب کیوں

تھا ایک ہی حجاب اجل نے اٹھا دیا   لاشے سے میرے تم کو ہے اتنا حجاب کیوں
کیا مسجدوں میں وعظ کی ہمت نہیں رہی   رندوں میں آ کے شیخ! ہوئے تم خراب کیوں
جز مفلسی نہیں مجھے کوئی گناہ یاد   لیتے ہیں یہ گناہوں کا میرے حساب کیوں
واصفؔ جو آنکھ وقت سحر با وضو نہ ہو
دیکھے جمال دوست کو وہ بے نقاب کیوں

(۷۰)

گمنام و کم آمیز ہوں معدوم نہیں ہوں   حیرت ہے کہ اپنوں کو بھی معلوم نہیں ہوں
ہے ذرۂ ناچیز بھی اک پارۂ خورشید   دیکھو تو سہی! نقطۂ موہوم نہیں ہوں
معصوموں کے اطوار بہت دیکھے ہیں میں نے   اللہ کا احسان ہے معصوم نہیں ہوں
تابش مری ممنونِ گلو بند نہیں ہے   جوہر ہوں مگر جوہر منظوم نہیں ہوں
آزاد ہے فطرت مری دل میرا غنی ہے   گردوں کی ستم گاری سے مغموم نہیں ہوں
تلبیس و تملق۔ مری غیرت کے مُنافی   جاندادۂ اندیشہ مقسوم نہیں ہوں
مانا کہ میں اک حرف غلط ہوں مگر اے دوست   کیا صفحۂ دل پر ترے مرقوم نہیں ہوں
ہے سوز بھی دل میں مرے اور ساز بھی لیکن   آتش کدۂ سازش مذموم نہیں ہوں
تدبیر کبھی مجھ کو سمجھنے کی بھی کرتے   میں آیۂ تقدیر کا مفہوم نہیں ہوں
سنتا ہوں یہ الزام کہ ظالم ہے یہ واصفؔ
صد شکر کہ بیچارۂ و مظلوم نہیں ہوں

(۷۱)

مفلس میں قناعت نہ سخاوت ہے غنی میں   کم ان میں سے کوئی بھی نہیں راہزنی میں
بڑھتا ہوا طوفان ہے یا اس کی جوانی   کس طرح سمائے گی یہ گل پیرہنی میں
اک قطرۂ خون شہدا ہم اسے کہتے   ہوتی جو حرارت بھی عقیق یمنی میں
ہاتھ آئے وہ کیونکر کہ قرار اس کو نہیں ہے   بجلی ہے تڑپتی ہوئی نازک بدنی میں
پنہاں ہیں خموشی میں یہاں لاکھ افسانے   ہے فرق مری اور تری کم سخنی میں
واصفؔ کے جگر میں نہ تھی اک بوند لہو کی   سرخی کی جھلک بھی نہیں نیزے کی انی میں

(۷۲)

آ ہم سفر اس خاک پہ دو اشک بہا لیں
مدفون یہاں کیا مرے افسانے نہیں ہیں
کیوں مجھ کو بلایا گیا صحرائے عدم سے
کافی مری وحشت کو یہ ویرانے نہیں ہیں
مل جائیں تو ممکن نہیں پھر ان کی جدائی
دو دل ہیں یہ تسبیح کے دو دانے نہیں ہیں
معلوم ہیں واعظ کے کمالات و فضائل
ہم خوگرِ تسلیم ہیں دیوانے نہیں ہیں
معذور سمجھ گر کوئی تقصیر ہوئی ہے
ہم ہوش میں اس وقت خدا جانے نہیں ہیں
سیراب انھیں آبلۂ پا سے کیا ہے
یہ کانٹے بھی واصف کوئی بیگانے نہیں ہیں

(۷۳)

کہتے نہیں کچھ بھی نہ یہاں کی نہ وہاں کی
پھر کیوں یہ ستارے مری جانب نگراں ہیں
آزادی کی منزل پہ سفر ختم نہیں ہے
آگے ابھی کچھ اور بھی قدموں کے نشاں ہیں
گلشن کا احاطہ کہیں یہ آگ نہ کر لے
تنکے ابھی دو چار ہیں جو شعلہ فشاں ہیں
واصف کو ہی سجتا ہے یہ ویرانۂ وحشت
جامے سے جو باہر نہ ہوں وہ لوگ کہاں ہیں

(۷۴)

کوئی حکمت مرض عشق میں چلتی ہی نہیں
ایسی بگڑی ہے طبیعت کہ سنبھلتی ہی نہیں
یاد رکھنے کی جو باتیں تھیں بھلا دیں میں نے
اک تری یاد ہے جو دل سے نکلتی ہی نہیں
منت ابر بہاراں نہ خزاں کا شکوہ
دل کی بستی میں کوئی فصل بدلتی ہی نہیں
دشت وحشت ہو کہ ہو صحن چمن اے واصفؔ
اب طبیعت کسی صورت سے بہلتی ہی نہیں

(۷۵)

نظر ہے مری متہم جانتا ہوں رقیبوں کی تشنیع و ذم جانتا ہوں
مگر اپنا جاہ و حشم جانتا ہوں مجھی سے ہے تیرا بھرم جانتا ہوں
کہوں کیا کہ عزم سفر اب کہاں ہے ندامت سے اشکوں کا دریا رواں ہے
یہی پیشکش ہے یہی ارمغاں ہے میں آداب ملک عدم جانتا ہوں

ترے غم سے دل سیر ہو گا نہ میرا نہ ہو کاش فرقت کی شب کا سویرا
ہمیشہ رہوں اور تصور ہو تیرا حیاتِ دو روزہ کو کم جانتا ہوں

(۷۶)

دم بھر اگر قرار نہ آئے تو کیا کروں   دل سے کسی کی یاد نہ جائے تو کیا کروں
پنہاں ہو چشم شوق سے وہ آفتاب حسن   ایسی بھی ایک شام جو آئے تو کیا کروں
جرم وفا میں جھیل رہا ہوں میں قید زیست   ان کے بغیر موت نہ آئے تو کیا کروں
حاصل ہے وہ سکون کہ اٹھوں نہ حشر تک   لیکن سر مزار وہ آئے تو کیا کروں
واصفؔ ہزار ضبط و تحمل کے باوجود   دل میں کسی کا غم نہ سمائے تو کیا کروں

(۷۷)

ہم سفر تھم تو سہی دل کو سنبھالوں تو چلوں   منزل دوست پہ دو اشک بہالوں تو چلوں
ہر قدم پر ہیں مرے دل کو ہزاروں الجھاؤ   دامن صبر کو کانٹوں سے چھڑالوں تو چلوں
مجھ سا کون آئے گا تجدید مکارم کے لئے   دشت امکاں کی ذرا خاک اڑالوں تو چلوں
بس غنیمت ہے یہ شیرازۂ لمحات بہار   دھوم سے جشن خرابات منالوں تو چلوں
پاؤں زخمی ہوئے اور دور ہے منزل واصفؔ   خونِ اسلاف کی عظمت کو جگالوں تو چلوں

(۷۸)

(اس غزل کی فنی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر مصرع کی تقطیع بحر رمل کے درج ذیل دونوں وزنوں پر ہو سکتی ہے)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن   فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن
دل کشی اب کوئی گلگشت خیاباں میں نہیں   واقف اپنا کوئی اب صحن گلستاں میں نہیں
ضعف پیہم سے اگر مجھ کو نہیں تاب سخن   تم سمجھتے ہو تلاطم مرے ارماں میں نہیں
پیش کر نذرِ وفا اہل توکل کے حضور   پرسش جنس وفا درگاہِ سلطاں میں نہیں
دولت ہر دو جہاں جس سے گداؤں کو ملی   آج وہ صبر و رضا مردِ مسلماں میں نہیں
خار ہوں تیری نظر میں ہوں مگر جزوِ چمن   کیا رگِ گل کا لہو خارِ گلستاں میں نہیں
کیا ہوا قید قفس سے جو رہائی بھی ملی   خاک بھی اب تو اڑانے کو گلستاں میں نہیں
یہ تو واصفؔ ہے جو رویا ہے باندوہ چمن   اشک شبنم کی نمی خاک شہیداں میں نہیں

(۷۹)

یہ مانا اہل ہوش اکثر مجھے غافل سمجھتے ہیں
مگر یہ دل کی باتیں ہیں جو اہل دل سمجھتے ہیں
کوئی ان بیکسوں کے حسرت وارماں کو کیا جانے
جو ہر اٹھتے ہوئے طوفان کو ساحل سمجھتے ہیں
پریشاں اس قدر جمعیت خاطر ہوئی اپنی
کہ ہر آوارہ ذرے کو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں
نفس کی آمد و شد ہی میں ہم کھوئے گئے ایسے
کہ ہر تار نفس کو جادۂ منزل سمجھتے ہیں
یہ انکے شہر میں کیا خوب ہے دستور خونریزی
نہ وہ تلوار اٹھاتے ہیں نہ ہم قاتل سمجھتے ہیں

(۸۰)

بجلی سی کوند جاتی ہے بخت سیاہ میں
سو سو ہیں تابشیں تری اک اک نگاہ میں
راز فنا کو سمجھے تو اتنا سمجھ سکے
بس اک نئے مقام سے گزرے ہیں راہ میں
جلووں کے ازدحام میں نیچی نگاہ رکھ
اے دل وقار عشق ہے ضبط نگاہ میں
واصفؔ نہیں ہے لطفِ مسلسل تو غم نہ کر
کچھ اور بات ہے کرم گاہ گاہ میں

(۸۱)

یہ حسن پرستی کا چسکا ہے فیض تمہاری الفت کا
کھاتے ہی کسی کا تیر نظر ہم تم کو پکارا کرتے ہیں
پنہاں ہے ہماری بات مگر محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے
باہم یہ یگانے بیگانے سب ذکر ہمارا کرتے ہیں
منزل کا پتہ کب ملتا ہے صحرا میں بھٹکنے والوں کو
جب انکا اشارہ ہوتا ہے تارے بھی اشارہ کرتے ہیں
اے کاش کوئی پوچھے تو سہی ان جاگنے والے تاروں سے
فرقت کی اندھیری راتیں ہم کس طرح گزارا کرتے ہیں

(۸۲)

اے دوست نہ کر ذلت کی نظر ان مسکینوں مجبوروں پر
ان خاک نشینوں میں اکثر جوہر قابل مل جاتے ہیں

تقدیر کچھ ایسی روٹھی ہے دل صاف نہیں ہوتا ان کا
اظہار وفا کرتے کرتے ہم خاک میں مل مل جاتے ہیں
یہ دانش و حکمت کے مکتب خالی ہیں حق آگاہوں سے
ہم جیسے خطا کاروں ہیں ہی کچھ صاحب دل مل جاتے ہیں
سیلاب نے میرے اشکوں کے روکا ہے یہاں آنے سے انھیں
خشکی پر جب دریا آئے، دونوں ساحل مل جاتے ہیں
حاصل ہو اگر ایمان و یقین انسان کا دل خوش رہتا ہے
طوفان کی زد میں اے واصفؔ سیکڑوں ساحل مل جاتے ہیں

(۸۳)

رہ گئی وہ ڈوب کر گفتار میں جو بلندی تھی کبھی کردار میں
بے مزہ ہے آج کل طبع سلیم تلخی حالات ہے افکار میں
آج تک جو راز پوشیدہ رہا کھل نہ جائے نبض کی رفتار میں
کیسے کیسے قاہروں کے دبدبے ہیں نہاں اجڑے ہوئے آثار میں
ہے وہ جوہر زینتِ طوق گلو جو چمکتا تھا کبھی تلوار میں
سن کے واصفؔ کی غزل برہم ہیں وہ بات کچھ ایسی نہ تھی اشعار میں

(۸۴)

برپا نہوں جب فتنے بجتی نہوں زنجیریں بیدار نہیں ہوتیں سوئی ہوئی تقدیریں
قوموں کی تباہی کی یہ صاف نشانی ہے رہ جاتی ہیں آخر میں تقریریں ہی تقریریں
معمورۂ الفت کو آباد سمجھتے تھے دیکھا تو نظر آئیں گرتی ہوئی تعمیریں
دیکھو گے کہاں تک تم خاموش نگاہوں سے یہ ڈوبی ہوئی نبضیں چلتی ہوئی شمشیریں
چھائی ہے زمانے پر تاریکی ہی تاریکی پنہاں ہیں کہاں یارب ایمان کی تنویریں
جمہور کی شاہی میں الفاظ کی قیمت ہے کس درجہ مقدس ہیں الفاظ کی تفسیریں
کس شوق سے محنت سے صحرا کو بسایا تھا برباد نہ کر ظالم! اسلاف کی جاگیریں
میں ہوں کہ مری حالت تبدیل نہیں ہوتی اور دہر میں برپا ہیں تغیروں پہ تغیریں

ہر ایک ادا ان کی محبوب و پسندیدہ
واصفؔ کے مقدر میں تقصیریں ہی تقصیریں

(۸۵)

(تضمین بر اشعار ظل سبحانی بہادر شاہ ظفرؔ رحمۃ اللہ علیہ)

کچھ نہ سوجھا نیک و بد غفلت میں مستی میں ہمیں   اب ملا لطف قناعت تنگدستی میں ہمیں
قدر رفعت کی ہوئی معلوم پستی میں ہمیں   کفر سے ایماں ملا اس ملک ہستی میں ہمیں
حق پرستی ہاتھ آئی بت پرستی میں ہمیں

کیسی ذلت کیا بڑائی خوب پھینکا چرخ نے   بے بسی تیری دہائی خوب پھینکا چرخ نے
خوب ہی دنیا دکھائی خوب پھینکا چرخ نے   اونچ نیچ ایسی جتائی خوب پھینکا چرخ نے
گہ بلندی پر ہمیں اور گاہ پستی میں ہمیں

یاں نہ دولت کو بقا ہے اور نہ شوکت کو قیام   آدمی ہوتا ہے رسوا بھول کر اپنا مقام
کیا ہی عبرت خیز ہے واصفؔ یہ شاہوں کا کلام   اے ظفرؔ جو کچھ کیے ہم نے زبردستی میں کام
انکے بدلے مل رہے ہیں زیردستی میں ہمیں   زبردستی: اقتدار

(۸۶)

نہ پوچھو کہ آنکھوں میں کیوں اشک آئے   سمجھ لو انھیں تم مسرت کے آنسو
ترحم کی امید رکھو خدا سے   اگر آنکھ میں ہیں ندامت کے آنسو
اٹھا کر انھیں اپنی آنکھوں پہ رکھو   بڑے بے بہا ہیں حکومت کے آنسو
ترا بندہ اور روئے غیروں کے آگے   گوارا ہیں کیونکر یہ ذلت کے آنسو
فقیروں کے حالات پر ہنسنے والو!   اکارت نہ جائیں گے غیرت کے آنسو

(۸۷)

پردہ ہٹا کے چہرۂ زیبا دکھاؤ تو   کہتے ہو بے وفا مجھے آنکھیں ملاؤ تو
ویراں ہے مدتوں سے گلستان آرزو   آکر مرے قریب ذرا مسکراؤ تو
میرے بغیر تم بھی تو رہتے تھے بیقرار   تم کو بھی یاد ہے وہ زمانہ بتاؤ تو
واصفؔ ہی آج زینت میدان عشق ہے
اس خستہ دل کو دے کے سہارا اٹھاؤ تو

(۸۸)

اپنی زلفوں پہ ان اشکوں کو بکھر جانے دو   شام عشرت کو ستاروں سے سنور جانے دو
میری گستاخ نگاہی کا گلہ ہی نہ رہے   وادئ دل میں تجلی کو اتر جانے دو
یاد رکھو کہ بدلتا نہیں آئین جہاں   یہ سفینہ ہے ستم کا اسے بھر جانے دو
آہ کی راہ میں یہ چرخ کہن حائل ہے   اب مری جان حزیں کو بھی اُدھر جانے دو
ان کے گھر تک نہوئی جس کی رسائی واصفؔ
ایسے بیمار کو اللہ کے گھر جانے دو

(۸۹)

بیگانے سے بڑھکر ہے جو ہے کوئی یگانہ   اک بادیۂ ریگ رواں ہے یہ زمانہ
انعام ہی سمجھوں گا اسے پیر مغاں کا   قسمت سے جو مل جائے مجھے دُرد شبانہ
شاید کہ کھلا راز تمھاری خفگی کا   فریاد! کہ ہے آج خفا ہم سے زمانہ
کچھ خون کے قطرے تھے جو باقی مرے دل میں   وہ قافلہ آنکھوں سے ہوا آج روانہ
محلول فضاؤں میں ہیں انفاسِ محبت
مرغان چمن گاتے ہیں واصفؔ کا ترانہ

(۹۰)

نہ صیاد کا ڈر نہ خوف خزاں ہے ملی مجھ کو وہ رفعت جاودانہ
برغم فلک شاخ برق طپاں پر ازل سے ہے قائم مرا آشیانہ
ہر اک کے نہیں بس کا یہ روگ ظالم کٹھن ہے محبت کو دل میں چھپانا
کہیں تجھ کو رسوا نہ کردے بالآخر یہ ہر بوالہوس سے ترا دوستانہ
چلائے بہت تیر آہوں کے میں نے مگر جس کو دیکھا وہ ناکام آیا
یہ تیر نظر ہی کو رتبہ ملا ہے کہ خالی نہیں جاتا اس کا نشانہ
تلفظ سے ہے پاک میرا تکلم کرے گا کوئی کیا مری ترجمانی
کبھی تم جو آنکھیں ملاؤ گے مجھ سے سنادوں گا دم بھر میں سارا فسانہ
ہوا شب کو واصفؔ عجیب اک لطیفہ بپا ان کے گھر بزم شعر و سخن تھی
حریفوں نے تیکھی نگاہوں سے دیکھا پڑھی میں نے جب اک غزل عاشقانہ

(۹۱)

محشر میں ہم سے پہلے وہ داد خواہ نکلے سمجھا تھا جن کو اپنا ان کے گواہ نکلے
روز جزا بھی ہم نے پائی نہ داد الفت وہ پاکباز ٹھیرا ہم بے گناہ نکلے
تھرا اٹھے زمیں بھی ہل جائے آسماں بھی یوں روئیے تو شاید ملنے کی راہ نکلے
گو پھنک رہا ہوں غم لیکن ہے یہ تقاضا ایک اشک بھی نہ ٹپکے موںھ سے نہ آہ نکلے
رہبر سمجھ کے ہم نے تھاما تھا جن کا دامن وہ بھی ہماری صورت گم کردہ راہ نکلے
جنت سے ہم کو واصفؔ تقصیر نے نکالا
دنیا سے بھی جو نکلے لے کر گناہ نکلے (۱۹۳۶ء)

(۹۲)

بہت ہی سخت ہے قانون فطرت ہراساں جس سے میری بیگناہی
کہاں یہ تنگی صحرائے امکاں کہاں ذوقِ جنوں کی بے پناہی
بہارِ زندگی تیری توجہ خزانِ دل ہے تیری کم نگاہی
ملی ہے مجھ کو الفت کی نشانی فغانِ شام و آہِ صبح گاہی
تجھے کیا ہو گیا ہے میرے واصفؔ
کہ یوں پھرتا ہے تو واہی تواہی (۱۹۳۹ء)

(۹۳)

بڑا اہل فن ہے یہ پیر مغاں بڑی اس کے در پر رجوعات ہے
ہے اختر شماری و قطع نفس یہ دن ہے ہمارا تو وہ رات ہے
ہمارے چمن میں خزاں ہی نہیں یہاں تو ہمیشہ ہی برسات ہے
چلو دست واعظ پہ بیعت کریں اسی کام میں کچھ فتوحات ہے
بجھی شمع یعنی سحر ہو گئی مری زندگی کیا ہے اک رات ہے
تری رحمتیں دور تر از قیاس مری بندگی کیا ہے اک بات ہے
بہت دور جانا ہے واصفؔ تمھیں ابھی درد دل کی شروعات ہے
(۱۹۴۱ء)

(۹۴)

زمانہ خود فغان نیم شب کو ختم کر دے گا
کہ تجھ سے ربط مجھ کو ارتباط جسم و جاں تک ہے
نشانِ راہ ناپیدا نہ ہمدم ہے نہ ہے رہبر
مکدر دشت میں مجھ سے غبارِ کارواں تک ہے
کسے معلوم ہے انجام تیری سعیٔ پیہم کا
بتا اے رہروِ ہستی سفر تیرا کہاں تک ہے
کہاں تو اور کہاں ہم آہ دل میلا نہ کر ساقی
یہ صحبت چند لمحوں کی رحیل کارواں تک ہے
ہٹا کر پردہ عقل نارسا کا دیکھ تو واصفؔ
کہ جذب دل کی وسعت پردہ گاہ لامکاں تک ہے (۱۹۴۴ء)

(۹۵)

ہنستا ہوں میں سب کی دیکھا دیکھی دل کی کسک کوئی کیا جانے
اس خندۂ بے کیف میں واصفؔ اک غم کی جھلک کوئی کیا جانے
غنچوں کی ہنسی کوئی کیا دیکھے پھولوں کی مہک کوئی کیا جانے
ہوتی ہے اب تو سیر چمن سے سر میں دھمک کوئی کیا جانے
چہرے پہ وقارِ استغنا رفتار میں عزمِ مردانہ
ان اہل جنوں کے تلووں میں چھالوں کی تپک کوئی کیا جانے
وہ قطرۂ ابر نیساں ہے یہ اختر شام ہجراں ہے
موتی تو چمک پر نازاں ہے آنسو کی دمک کوئی کیا جانے
جلووں کا تلاطم جوش قدح ساقی خنداں محفل شاداں
لیکن عاشق کی رگ جاں میں مبہم سی کھٹک کوئی کیا جانے
محسوس تھکن جب ہوتی ہے اک جرعۂ غم پی لیتا ہوں
ہے دل کی دوا یہ تلخیٔ غم واصفؔ یہ چسک کوئی کیا جانے (۱۹۴۶ء)

(۹۶)

فعلُ فعولن فعلن فعلن چار بار

چارہ گری کیا ہوگی تجھ سے عشق و وفا کے بیماروں کی
سانس نہیں ہے یہ لرزش ہے ساز شکستہ کے تاروں کی

چین سے سونے والو تم بھی کاش کبھی تو دیکھو آکر
چشم کشادہ مجبوروں کی آہ و فغاں شب بیداروں کی
آخر شب کے سناٹے میں ضبط کا دامن مجھ سے چھوٹا
زخمۂ غم سے ساری بندش ٹوٹ گئی دل کے تاروں کی
اہل وطن کے ہاتھوں میں سامانِ ضیافت ہر دم حاضر
جوشِ جنوں کو میرے واصفؔ کیا ہو تمنا دیواروں کی

(۹۷)

دل کی بیتابی کا ہمدم گر سناؤں ماجرا
موج طوفاں کانپ اٹھے برق تھرانے لگے
آہ! تو نے کیا مری آنکھوں پہ جادو کر دیا
دیدہ بازی سے مری تارے بھی شرمانے لگے
وہ جنوں کی بے پناہی یہ بیاباں کے حدود
اس قفس میں کیوں نہ میری روح گھبرانے لگے
کاش میری روح پر یہ بار احساں بھی نہو
آپ کیوں مرنے پہ میرے آج پچھتانے لگے

(۹۸)

جس کی نظر میں کچھ نہو تیرے جمال کے سوا
اس کی نظر میں ایک ہے دشت ہو یا تری گلی
رشک نبات ہے تو ہو تیرا کلام ہم نشیں
غم سے ہوا ہوں تلخ کام زہر ہے قند کی ڈلی
حسرت و وحشت و جنوں لمحہ بہ لمحہ ہے فزوں
یاس میں آرزو میں ہے آج غضب کی کھلبلی
ختم ہوئی شب نشاط بجھ گئی شمع آرزو
ٹھیر تو جا دل حزیں! دیکھ تو صبح ہو چلی
آکہ وفورِ شوق سے دھوئی گئیں کدورتیں
آکہ گدازِ شوق سے سینہ ہوا ہے منجلی
واصفؔ زار کو کبھی آیا نہ راس یہ چمن
چرخِ ستم ظریف نے چھاتی پہ مونگ ہی دلی (۱۹۴۵ء)

(۹۹)

ہم نے کیا کیا کچھ کیا اس مضطرب دل کیلئے
کس قدر بے حاصلی جھیلی ہے حاصل کیلئے
منزلیں طے کی ہیں کتنی ایک منزل کے لئے
مشکلیں کتنی اٹھائیں ایک مشکل کے لئے
دل میں ذوق سعی ہو آنکھوں میں تنویر رضا
ہے یہی آئین پابند سلاسل کے لئے
شمع کی لو اور یہ ہنگامۂ بود و نبود
ایک اشارہ مکتفی ہوتا ہے عاقل کے لئے

اس طرف ہے دودِ آوارہ ادھر لاشوں کے ڈھیر   یہ معما حل طلب ہے اہل محفل کے لئے
آہ کیا دن تھے کہ سائل گلفشاں تھا بزم میں   بزم ہے گوہر بداماں آج سائل کے لئے
اس جہاں سے یوں گزر جا جیسے برق التفات
اور ہیں واصفؔ ابھی کچھ مرحلے دل کے لئے   (۱۹۴۵ء)

(۱۰۰)

آنکھیں برس کے کھل گئیں دل کی فضا نکھر گئی   آ کہ تری حریم ناز تیرے لئے سنور گئی
بیٹھا ہوں تیری راہ میں خستہ جگر شکستہ پا   گرم سفر ہے روزگار شام ہوئی سحر گئی
اٹکی مژہ پہ اشک تھا نیزے پہ یا تھا آفتاب   اف وہ گھڑی بھی حشر کی دل پہ مرے گزر گئی
محفل شب میں کس کو تھا مجھ پہ گمان عاشقی   تیری نگاہ کی حیا تہمت عشق دھر گئی
اختر صبح! کیا کہوں اپنے وطن کا ماجرا   شمع خلوص بجھ گئی، بزم وفا بکھر گئی
زیرکیِ ملک سے ہے فطرت آدمی خجل   فتنۂ مشت خاک سے نبض فلک ٹھہر گئی
مژدۂ جوش گل کہاں کیسی حدیث کوئے دوست   چھیڑ کے دل کے ساز کو موج صبا گزر گئی
سینہ ہوا ہے داغ داغ غم سے مجھے نہیں فراغ   ایک یہ فصل گل ہی کیا عمر یونہی گزر گئی
تار نظر میں اشک سے موتی پرو رہا تھا میں   آہ! فرط گریہ سے آبروئے گہر گئی

(۱۰۱)

تقدیر میں یہ کارگہ رنج و تعب تھی   اک لغزش معصوم قیامت تھی غضب تھی
اب ہے طلب پاس وفا تم سے نہ جب تھی   فرصت مجھے خود اپنی وفاؤں سے ہی کب تھی
وہ شانِ کرم رات کو ساقی نے دکھائی   ناصح کی نگاہوں میں بھی در پردہ طلب تھی
ہم آپ ہی آپ آتش غیرت میں جلے رات   پہنچے نہ سرِ شمع کہ وہ جائے ادب تھی
تھا غلغلہ افلاک میں نالوں سے کسی کے   دیکھا جو دم صبح تو اک جنبش لب تھی
طوفاں بقدم خاک بسر میکدہ بردوش
واصفؔ کی جوانی بھی قیامت تھی غضب تھی

(۱۰۲)

پردہ دارِ دردِ دل ہے حرفِ منت ہی سہی   مایہ دار اشک ہے چشم مسرت ہی سہی

چھوٹ کر قید حرم سے دیر کو جاتا ہوں میں
حلقۂ زلف برہمن کی اسارت ہی سہی
تو نے میرے دل کو بھی ہمدم ٹٹولا ہے کبھی
تیرے دل رکھنے کو میں مجبور عشرت ہی سہی
اب وطن بھی تیرے وحشی کیلئے ویرانہ ہے
خاک اڑانے کیلئے ایک دشت غربت ہی سہی
بس غنیمت ہے یہ ربط جسم و جاں اے ہم نشیں
فکر فردا گر نہیں امروزہ عشرت ہی سہی
کون ہے کوچے میں تیرے مرد میدانِ وفا؟
واصفؔ دلِ سوختہ سے تجھ کو نفرت ہی سہی

(۱۰۳)

آج ان کی بارگہ میں پرسشِ احوال ہے
کیا کہیں اپنی زباں سے ہم جو اپنا حال ہے
آ کہ جی بھر کر اٹھا لیں آج لطف زندگی
آہ! یہ کوتاہ دن مرہونِ ماہ و سال ہے
اے صبا! جا کر یہ کہنا غالبؔ مرحوم سے
اب غمِ الفت کا پھر تیرے وطن میں کال ہے
ننگ فطرت ہے یہ انساں گر نہو پہلو میں دل
آدمی کی آدمیت نیکیٔ اعمال ہے
کیوں گلہ کرتے ہو واصفؔ غیر کی بیداد کا
غیر کی صورت میں اپنی شامت اعمال ہے

(۱۰۴)

مری بالیں پہ یہ آنسو بہانے کون آتا ہے
یہ اک قطرے کو دریا سے ملانے کون آتا ہے
مری تربت کی اب یہ خاک اڑانے کون آتا ہے
مری مٹی کو اپنے سر چڑھانے کون آتا ہے
مرے ایمان پر بجلی گرانے کون آتا ہے
یہ تمیز حق و باطل مٹانے کون آتا ہے
فضا مخمور بلبل مست گل بیخود ہوا رقصاں
چمن میں آج جشنِ مے منانے کون آتا ہے
فرشتے دم بخود ہیں عرصۂ محشر میں ہے ہلچل
یہ اپنی داستانِ غم سنانے کون آتا ہے
بڑی بیداریوں کے بعد گہری نیند سوئے ہیں
شہیدانِ محبت کو جگانے کون آتا ہے
یہ پابندیٔ آداب جنوں واصفؔ کے دم تک تھی
اب ان پارینہ رسموں کو جلانے کون آتا ہے

(۱۰۵)

حضور دوست میں اہل فغاں کی آزمائش ہے
زباں پر قفل ہے لیکن زباں کی آزمائش ہے
سبک ظرفی ہے اور رطل گراں کی آزمائش ہے
گراں جانی ہے اور تیغ و سناں کی آزمائش ہے
کہیں تابانیٔ حسن جواں کی آزمائش ہے
کہیں بے رونقی شمع جاں کی آزمائش ہے

لہو رلوا دیا سرخی نے جسکی سننے والوں کو   سر بزم آج پھر اس داستاں کی آزمائش ہے
کھلے گا انجمن میں حسن کا بھی حوصلہ آخر   ابھی تو عشق کی تاب و تواں کی آزمائش ہے
اُدھر یہ حکم ہے کھلنے نہ پائے راز پنہانی   اِدھر نبض مریض ناتواں کی آزمائش ہے
ذرا خطرے سے اہل کارواں ہشیار ہو جانا   کہ اس صحرا میں نظم کارواں کی آزمائش ہے
فلک سے تابکے شکوہ فغاں کی نارسائی کا   سنبھل لے دل کہ اب سوز نہاں کی آزمائش ہے
جگر بھی دیکھ لینا پھر اگر تم دیکھنا چاہو   ابھی تو شدت و تاب کماں کی آزمائش ہے
زمین و آسماں اس امتحاں کی تاب کیا لاتے   یہ مشت استخواں اور دو جہاں کی آزمائش ہے
حقیقت کیا شکستہ سوختہ پامال تنکوں کی   مگر پھر بھی وقار آشیاں کی آزمائش ہے
یہ توہینِ حمیت یہ اذیت یہ ستم کیشی   دل مجبور کے عزم نہاں کی آزمائش ہے
بقدر ظرف لازم تھی شرابِ دید اے ساقی   سر مغرور و قلب شادماں کی آزمائش ہے
سنبھالو! قصر استبداد کو اے زر کے متوالو!   غم بے سود و سعیٔ رائگاں کی آزمائش ہے
جہاں والوں سے اب چلتا نہیں کار جہانبانی   خدایا تابکے اہل جہاں کی آزمائش ہے
کہاں تک یہ نظام کہنہ، کون و فساد آخر   کہاں تک مہر و ماہ و کہکشاں کی آزمائش ہے

ابھی کچھ دیر ہے واصفؔ زمانہ پھر بھی بدلے گا
ابھی کچھ اور مرد ناتواں کی آزمائش ہے

(۱۰۶)

آہ! وہ وقت جب کوئی مجرم   حاضر بارگاہ ہوتا ہے
سوز و ساز شرار عشق نہ پوچھ   کوہ بھی گھل کے کاہ ہوتا ہے
ہے یہ وہ منزل وفا کہ جہاں   آنکھ اٹھانا گناہ ہوتا ہے
لٹتے دیکھا ہے تم نے دلّی کو   دل بھی یوں ہی تباہ ہوتا ہے
کیا بہار اور کیا خزاں واصفؔ   سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے

(۱۰۷)

جب سے غم سازگار ہے پیارے   زندگی خوشگوار ہے پیارے
نام بھی میں نہ لوں محبت کا   دل پہ کیا اختیار ہے پیارے

باز آتا نہیں محبت سے   دل بڑا نابکار ہے پیارے
سامنے ہے خزاں تو کیا غم ہے   اس کے پیچھے بہار ہے پیارے
منتظر ایک آہِ سوزاں کی   رحمت کردگار ہے پیارے
یہ جو محفل میں سرنگوں ہے کوئی   واصفؔ باوقار ہے پیارے

(۱۰۸)

ہے آرزو کہ راہ میں وہ فتنہ گر ملے   ایسا کہاں نصیب ہے لیکن اگر ملے؟
لمحات انتظار کی لذت نہ پوچھیے   کیا بات اس قدح کی جو وقت سحر ملے
کیا ہو دلوں کا حال خدا جانے بزم میں   جس وقت بے ارادہ نظر سے نظر ملے
یہ جان و تن کا ربط جسے زندگی کہیں   ایسا ہے جیسے راہ میں دو ہم سفر ملے
واصفؔ یہ سوچتا ہوں کروں التجائے وصل   مہلت مجھے ثبوت وفا سے اگر ملے

(۱۰۹)

مرے جنوں کو میسر نہیں کمال ابھی   کہ گھر اجڑنے کا ہوتا ہے کچھ ملال ابھی
فدا حضور پہ کس کس طرح ہوئے ہیں ہم   مگر ہماری وفا میں ہے قیل و قال ابھی
ابھی متاع دل و جاں بھی نذر کرنی ہے   نہیں ہے شیخ! یہ بنت عنب حلال ابھی
ہوا زمانہ کہ مل کر کوئی بچھڑ بھی گیا   مگر نظر میں ہے وہ جنت خیال ابھی
یہ ساری عمر کے ارمان رائگاں ہی سہی   دل غیور نہیں مائلِ سوال ابھی

(۱۱۰)

نہ پوچھو اس دل مضطر کی منزل   فلک پر بھی ہے پا انداز بھی ہے
سن اے مست مئے عیش و طرب سن   سکوت شب کی ایک آواز بھی ہے
شکستہ ہیں جو یہ شاہیں کے بازو   انھیں میں عظمت پرواز بھی ہے
رخِ واصفؔ پہ یہ موج تبسم   گداز قلب کی غماز بھی ہے

(۱۱۱)

خزاں ہو یا بہار آہ و فغاں یوں بھی ہے اور یوں بھی
مری آنکھوں سے جوئے خوں رواں یوں بھی ہے اور یوں بھی

بھڑک اٹھیں جگر کے داغ یا بجلی کہیں چمکے
نظر سے جادۂ منزل نہاں یوں بھی ہے اور یوں بھی
نہ ہنسنا راس آتا ہے نہ رونا کام دیتا ہے
مرے حق میں فلک نامہرباں یوں بھی ہے اور یوں بھی
چھلکتا ہے کسی کا جام اور کوئی ترستا ہے
کہ دستور خرابات جہاں یوں بھی ہے اور یوں بھی
کلی کوئی کھلے یا پھول کوئی کھل کے مرجھائے
مگر قائم نظام گلستاں یوں بھی ہے اور یوں بھی
بھلا مجھ ناتواں سے رشتہ ٹوٹے گا محبت کا
قسم لیتے ہو کیوں مجھ سے زباں یوں بھی ہے اور یوں بھی
نہ دو اے کاش تکلیف سخن اے دوستو! مجھ کو
مرا جو حال ہے تم پر عیاں یوں بھی ہے اور یوں بھی
اُدھر ظلم و ستم ان کا اِدھر طعنے عزیزوں کے
ہمارے سر پہ واصف آسماں یوں بھی ہے اور یوں بھی

(۱۱۲)

یہ راز جنوں کون سمجھا رہا ہے   کہ دل خود بخود راہ پر آرہا ہے
جھکی جا رہی ہیں اُدھر ان کی نظریں   اِدھر سارا عالم جھکا جا رہا ہے
انھیں اپنا وعدہ نہ یاد آگیا ہو   سحر سے ہی دل میرا گھبرا رہا ہے
خطرہائے راہ محبت نہ پوچھو   کہ آنسو بھی پلکوں پہ تھرا رہا ہے۔
سنبھالو سفینے کو اے کھینے والو!   کہ طوفان سر پر چڑھا آرہا ہے

(۱۱۳)

دل میں داغ عصیاں ہے رخ پہ نور یزداں ہے   کار ساز عالم کا شاہکار انساں ہے
ہیچ ہم سمجھتے تھے اب جو غور سے دیکھا   اک جہانِ بیتابی ذرۂ بیاباں ہے
مجھ سے پوچھ اے واعظ راستہ حقیقت کا   برقِ جادۂ منزل میرا داغِ عصیاں ہے

اے خرام بے پروا اف یہ سبزۂ نوخیز
فرش پا سہی لیکن زادۂ گلستاں ہے
خواب میں جو وہ آئے زلف ان کی برہم تھی
جب سے ہم نشیں میرا دل بہت پریشاں ہے
سوچتا ہوں جی اٹھوں پھر کسی کا لے کر نام
قتل پر مرے واصفؔ اب کوئی پشیماں ہے

(۱۱۴)

جو باقی ہو حسرت مرے امتحاں کی
تو گردش کو روکو ذرا آسماں کی
نہو غم تو دل کی حقیقت ہی کیا ہے
مکیں سے ہی بنتی ہے عزت مکاں کی
ابھی طاقت ضبط ہے میرے دل میں
ضرورت نہیں ہے مجھے رازداں کی
جدائی تو ہم تم میں ہو کر رہے گی
کہ رسم کہن ہے یہ دور جہاں کی
کہیں برق تم پر نہو جائے مائل
گلو! خیر مانگو مرے آشیاں کی

(۱۱۵)

کبھی جھلکا طرفِ حجاب سے کبھی جھانکا گوشۂ بام سے
مری کم نگاہی کو ہے گلہ ترے حسنِ برق خرام سے
جو یقیں نہیں ہے تو فائدہ نہ سجود سے نہ قیام سے
کہ ہزار منزلیں طے ہوئیں مری ایک لغزش گام سے
کوئی سن سکے تو سناؤں میں جو کھلی ہیں مجھ پہ حقیقتیں
کسی میگسار کی صبح سے کسی غم نصیب کی شام سے
رہے جھونکے بادنسیم کے رہے چھینٹے ابر بہار کے
مگر آج تک نہ ملا سکوں مرے دل کو سوز دوام سے
یہ بنا رہے ترا میکدہ وہ شراب دے مجھے ساقیا!
کہ بدل دوں گردش چرخ کو فقط ایک گردش جام سے
اسی اجنبی سے ہے دوستی اسی بے وفا سے ہے واسطہ
نہ نوازے واصفِؔ زار کو جو کبھی جوابِ سلام سے

(۱۱۶)

یہ وحشت کی دشوار راہیں خدایا
بھٹک جاتے ہیں کارواں چلتے چلتے

خدایا زمانے کی منزل کہاں ہے　　بہت تھک گیا آسماں چلتے چلتے
ذرا ڈھونڈنا میرے آنسو کو یارو!　　مسافر ہوا گم کہاں چلتے چلتے
نہ سمجھی کسی نے زباں میری واصفؔ　　یوں ہی رہ گئی کل زباں چلتے چلتے

(۱۱۷)

زمانے میں اسی انسان کی توقیر ہوتی ہے　　نظر جس کی گداز عشق کی تفسیر ہوتی ہے
نہ ہو مایوس ناکامی پہ اپنی اے دل ناداں　　شکست آرزو سے زندگی تعمیر ہوتی ہے
خود اپنی آگ میں جل مرتے پروانے تو اچھا تھا　　کہ ان گستاخیوں سے شمع بھی دل گیر ہو ہے
نہ ہو محفل میں کوئی نو گرفتارِ بلا واصفؔ　　ترے نغموں میں تمکیں آزما تاثیر ہوتی ہے

(۱۱۸)

فقط اک دھواں سا ہے سینے میں باقی　　ہوئی دل کی تمت شرر اڑتے اڑتے
خدا خیر رکھے کہیں راہ بھولا　　مرا طائر نامہ بر اڑتے اڑتے
خدا دل کو سمجھے بڑا ہی نڈر ہے　　لڑاتا ہے ظالم نظر اڑتے اڑتے
اڑائیں گے کیا آپ واصفؔ کے پرزے　　اڑیں گے یہ پرزے مگر اڑتے اڑتے

(۱۱۹)

آنسو رہِ وفا میں گراتے گزر گئے　　لوٹو! کہ ہم خزانے لٹاتے گزر گئے
ہستی کے رہگذار میں کس کو قیام ہے　　آئے ادھر تو ملتے ملاتے گزر گئے
افسوس ان کے گھر کا پتہ ہی نہیں ملا　　ہم جی سے اپنے آتے ہی جاتے گزر گئے
ملتی نہیں ہر ایک کو یہ دولت جنوں　　کتنے ہی آئے خاک اڑاتے گزر گئے
منزل ہماری دوزخ و جنت سے تھی بلند　　دیر و حرم سے آنکھ بچاتے گزر گئے
واصفؔ سے ہم ملے جو سر رہگذار عشق　　باہم دلوں کے داغ دکھاتے گزر گئے

(۱۱۹)

نہ ادھر جائیں کبھی ہم نہ وہ ہم تک پہنچے　　کیا بنے بات جہاں بات بھرم تک پہنچے
تیرے وعدے کا تو ہر طرح یقیں ہے مجھ کو　　بات وہ بات ہی کیا ہے جو قسم تک پہنچے
یہ حوادث کے تھپیڑوں کا کرم تھا ورنہ　　کس کی طاقت کہ ترے نقش قدم تک پہنچے

تیرے بندوں نے صنم خانوں میں تجھ کو ڈھونڈھا   اور صنم تیرے تجسس میں حرم تک پہنچے
فقر میں ہاتھ سے غیرت کو نہ دینا واصفؔ   یہ فضائل ہیں جو اسلاف سے ہم تک پہنچے

(۱۲۰)

وفادار یہ دوست کب رہ سکیں گے جو ہم سہہ چکے ہیں یہ کیا سہہ سکیں گے
نہ تم سن سکو گے نہ ہم کہہ سکیں گے کہ یہ زندگی ہم نے کیونکر گزاری
یہ خلق احبا یہ لطف عزیزاں بنی کے ہی ساتھی ہیں سب جن و انساں
نہ رکھو زمانے سے امید احساں بنائے گا کوئی نہ بگڑی تمھاری
نہ ہے کوئی نیکی نہ ہے کوئی دولت مرے پاس کیا ہے بجز اشک حسرت
جو ہو جائے مائل ادھر تیری رحمت تو واصفؔ کا پلڑا ابھی ہو جائے بھاری

(۱۲۱)

بیچارگی اہل ہم کچھ نہ پوچھیے   کس سمت اٹھ رہے ہیں قدم کچھ نہ پوچھیے
چہرہ اداس نیچی نظر دل میں اضطراب   رہتے ہیں کس خیال میں ہم کچھ نہ پوچھیے
ممکن ہے آپ کے دل نازک پہ گراں ہو   مائل ہیں کس حسین پہ ہم کچھ نہ پوچھیے
ہے سادگی ہماری متاع سکون دل   کیا کیا ہے ان سے چشم کرم کچھ نہ پوچھیے
جام شراب ساقی مہ رو کنار آب   کیا بات ہے خدا کی قسم کچھ نہ پوچھیے
ایک آہِ بد نصیب نے مجرم بنا دیا   کیا کیا ہوئے ہیں ہم پہ ستم کچھ نہ پوچھیے
واصفؔ زہے نصیب کہ اس فتنہ گر نے آج
کھائی ہے میرے سر کی قسم کچھ نہ پوچھیے

(۱۲۲)

ہم دل کو طلب گار آزار نہیں کرتے   پیار آتا ہے خود تم پر ہم پیار نہیں کرتے
تھم جاؤ مرے اشکو! ہے جائے ادب دیکھو   اس طرح تمنا کا اظہار نہیں کرتے
تم شاہ نگاراں ہو شاہوں کے چلن سیکھو   اجڑے ہوئے شہروں پر یلغار نہیں کرتے
ایسے بھی ہیں دل والے ان خاک نشینوں میں   کیسی ہی اذیت ہو اظہار نہیں کرتے
جو باد سحر سے بھی آرام نہ پاتے تھے   اب ان کو بگولے بھی بیدار نہیں کرتے

اظہارِ صداقت پر مجبور نہ بن واصفؔ
اتنا بھی زمانے کو بیزار نہیں کرتے

(۱۲۳)

سر گشتۂ سودائے انجام نہیں ہوتے
دل والے کبھی واصفؔ ناکام نہیں ہوتے
ہے یاد مجھے اب تک وہ دشت جنوں جسمیں
افکار نہیں ہوتے آلام نہیں ہوتے
شہرت سے جو بچتے ہیں عزت انھیں ملتی ہے
گمنام جو رہتے ہیں گمنام نہیں ہوتے
کیا خوف حریفوں کا ہم دشت نوردوں کو
دیوانے کبھی صید اوہام نہیں ہوتے

(۱۲۴)

گلوں کے رنگ و بو پر دل ترا مائل کہاں تک ہے
قیام اس گلشن ہستی میں اے غافل کہاں تک ہے
یہ پروانہ وقار عشق میں کامل کہاں تک ہے
ادھر دیکھو ہماری احتیاطِ دل کہاں تک ہے
یہ موجیں بار بار اٹھتی ہیں طاقت آزماتی ہیں
ہمیں بھی دیکھنا ہے ہمت ساحل کہاں تک ہے
نہ تھا یہ مسلہ میرے لئے کچھ غور کے قابل
کہ یہ میری وفا انعام کے قابل کہاں تک ہے
پہنچ کر سرحد منزل پہ کیوں شاداں ہے اے رہرو!
ابھی تو دیکھنا ہے وسعت منزل کہاں تک ہے
مرے سوز نہاں سے ہے تجھے اے شمع کیا نسبت
یہ تابانی تری اے زینت محفل کہاں تک ہے

(۱۲۵)

کسی کے گیسوؤں کی برہمی دیکھی نہیں جاتی
صبا ہم سے یہ تیری دل لگی دیکھی نہیں جاتی
خدا کے واسطے اپنے کیے پر تم نہ پچھتاؤ
کہ ہم سے حسن کی شرمندگی دیکھی نہیں جاتی
یہ دنیا ہے یہاں مکر و دغا کی قدر ہوتی ہے
ہنرمندوں کی شانِ بوذری دیکھی نہیں جاتی
ترے بندوں کے ناموس وحیا کو آزماتے ہیں
خدایا اب تو یہ بیچارگی دیکھی نہیں جاتی

یہ میخانہ ہے ہر اک کو بقدر ظرف ملتی ہے کسی کی خواجگی و بندگی دیکھی نہیں جاتی
بنایا خوگر تسلیم کچھ ایسا محبت نے کہ اب دشمن کی بھی آزردگی دکھی نہیں جاتی
مرا دل دیکھتے ہو دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو کہ ان آنکھوں سے دل کی روشنی دیکھی نہیں جاتی
حقیقت کیا ہے ان بکھرے ہوئے دو چار تنکوں کی یہ حیثیت بھی اللہ غنی دیکھی نہیں جاتی
اگر ہے چشم تر واصفؔ تو بیڑا پار ہے تیرا حضور دوست میں تر دامنی دیکھی نہیں جاتی

(۱۲۶)

ہے تمھارے نام سے کامل مرا اسلام بھی بعد مردن مجھ سے پوچھیں گے تمھارا نام بھی
دوستو! کاندھوں پہ لیکر تم کہاں تک جاؤ گے اس مسافر کے لئے لازم ہے کچھ آرام بھی
جھوم جاتا ہے مرا دل تلخ گوئی پر تری ربط پنہاں گر نہ ہو ملتی نہیں دشنام بھی
بے عمل کیا ہوں گے ناکامی سے لذت آشنا کام والے ہی کبھی ہو جاتے ہیں ناکام بھی
اپنا اپنا ہے مقدر اپنی اپنی ہے نگاہ سیکڑوں پردے بھی ہیں اور ہے تجلی عام بھی
مل گیا کعبے میں جا کر بادۂ وحدت کا جام لذت سجدہ سے واقف ہو گئے اصنام بھی

(۱۲۷)

تیر کھا کر بھی بسمل نہیں ہونے پاتے ہم کبھی ضبط سے غافل نہیں ہونے پاتے
قابل داد ہے ہمت ترے دیوانوں کی ناتوانی میں بھی کاہل نہیں ہونے پاتے
معرفت نقش قدم کی نہ میسر ہو جنھیں کچھ بھی ہو رہبر منزل نہیں ہونے پاتے
میرے بازو جو مہمات میں قاصر نہ رہے ان کی گردن میں حمائل نہیں ہونے پاتے
صیقل عشق سے جن کو نہ جلا ملتی ہو وہ کبھی جوہر قابل نہیں ہونے پاتے

چشم ساقی کا ہے فیضان یہ ہم پر واصفؔ
غم کے آداب سے غافل نہیں ہونے پاتے

(نوٹ: ردیف دہلی کے محاورے کے خلاف ہے مگر طرحی غزل ہے۔ واصفؔ)

(۱۲۸)

وہ مجاہدانِ رہِ وفا جو وجود اپنا مٹا گئے
کبھی آندھیوں سے نہ بجھ سکا جو چراغ راہ جلا گئے

دم صبح جھونکے نسیم کے شب غم کی شمع بجھا گئے
شب غم کی شمع کا سوز بھی مجھے دے کے اور جلا گئے
کبھی کائنات پہ چھا گئے کبھی میرے دل میں سما گئے
یہ نمود حسن کے معجزے مجھے کش مکش میں پھنسا گئے
پس مرگ بھی نہ سکوں ملا وہی ان کا جور و ستم رہا
کبھی اس طرف جو گزر ہوا تو لحد کی خاک اڑا گئے
مری ناتوانی کا ہو برا کہ میں کارواں سے بچھڑ گیا
ہوئی مجھ سے ایسی بھی کیا خطا کہ نشان پا بھی مٹا گئے
بڑی احتیاط سے ہم رہے مگر ان کی محفل ناز میں
کبھی مونھ سے آہ نکل گئی کبھی اشک آنکھوں میں آ گئے
کوئی نغمہ مطرب خوش نوا کوئی جرعہ ساقی خوش ادا
یہ ستم یہ فتنے یہ حادثے دل مبتلا کو تھکا گئے
ترا دم بھی واصفؔ خوش قدم بہ ہجوم یاس ہے مغتنم
گئے واقفان رموز غم تو بساط غم بھی اٹھا گئے

(۱۲۹)

خوبی قسمت سے آزادی کی دیوی مل گئی
اس کی زلفوں کو مگر ہے حاجت شانہ ابھی
سوز غم سے آب آ جانے دو اشکوں پر مرے
طائر مقصود کے لائق نہیں دانہ ابھی
آؤ پیر میکدہ کے ہاتھ پر بیعت کریں
کچھ یہاں باقی ہیں اخلاق کریمانہ ابھی
پاؤں ہیں واصفؔ کے زخمی اور دل ٹوٹا ہوا
ہے عیاں نظروں سے لیکن عزم مردانہ ابھی

(۱۳۰)

ملتے ہو کسی اور سے شک ہے تو یہی ہے
اے دوست مرے دل میں کھٹک ہے تو یہی ہے
لو دیتا ہے رہ رہ کے مرا داغِ تمنا
ظلمت کدۂ دل میں چمک ہے تو یہی ہے
حوروں کے تصور میں ہے دنیا سے گریزاں
زاہد کو اگر کوئی لٹک ہے تو یہی ہے
خودداری فطرت سے ہوں عالم میں سرافراز
مجبور محبت ہوں لچک ہے تو یہی ہے

عسرت میں نہ چھوٹے کبھی دامان تحمل انسان کی عظمت کی محک ہے تو یہی ہے
ہے پاک ریا کاری و تلبیس سے باطن چہرے پہ قلندر کے دمک ہے تو یہی ہے

(۱۳۱)

تجھے ابتدا کی خبر نہیں تجھے انتہا میں کلام ہے
تو سمجھ رہا ہے کہ زندگی یہی صبح ہے یہ شام ہے
کسی رہنما کا نہ کر گلہ ترا عزم ہی ابھی خام ہے
جو سنبھل سنبھل کے بڑھا چلے وہی رہنما ہے امام ہے
تری جستجو میں چلا تھا میں مجھے ہست و نیست کی کیا خبر
یہ مقام کونسا آگیا نہ سفر ہے اب نہ قیام ہے
یہ ہمارے عشق کا ارتقا کہ نکھر نکھر کے نظر بنے
نہ سوال ہے نہ جواب ہے نہ کلیم ہے نہ کلام ہے
سر راہ رات کو محتسب جو ملا نشے میں تو یہ کھلا
پیو چھپ کے مے تو حلال ہے کوئی دیکھ لے تو حرام ہے
کہے کیا یہ واصفؔ بے نوا کہ ہے زندگی کا نظام کیا
وہی داغ ہجر کی تابشیں وہی اختر سر شام ہے

(۱۳۲)

تجھے مستعار اس نے دی ہے یہ دولت یہ اعزاز و منصب یہ کاخ اور حویلی
نہ لا تو کبھی لب پہ حرف شکایت اگر اس نے واپس کوئی چیز لے لی
ہوئے ہم کسی کے نہ مرہون منت عطا کی خدا نے ہمیں ایسی ہمت
اگر ناخدا نے کبھی کی ہے غفلت تو کشتی بھی خود اپنے ہاتھوں سے کھے لی
سنی عمر بھر یہ پرانی کہاوت کہ ہوتی ہے تکلیف کے بعد راحت
نہ نکلی مگر آج تک کوئی حسرت الم بھی اٹھائے مصیبت بھی جھیلی
نہیں زال دنیا سزاوار الفت یہ دنیا ہے اے دل بڑی حیلہ خصلت
دکھاتی ہے ہر دم نئی شکل و صورت کرشمے نرالے ادائیں نویلی

لیا چھوڑ کر گھر کو صحرائے وحشت کھلاتی رہی ٹھوکریں ہم کو قسمت
پس مرگ آخر پئے استراحت ملی صاف ستھری منور حویلی
نسیم سحر سے ہے مجھ کر شکایت نہ لائی کبھی ان کی زلفوں کی نکہت
مرے دل کو ڈستی ہے ناگن کی صورت بنی پھرتی ہے بوئے گل کی سہیلی
ہوا تھا میسر وہ کیفِ محبت کہ حاصل تھی ہر دم تمھاری رفاقت
تمھاری خوشی میں ہے واصفؔ کو راحت اگر جا رہے ہو تو اللہ بیلی

(۱۳۳)

مانا کہ تمھیں ہم سے کوئی بیر نہیں ہے   غیروں کی مگر بات کا سر پیر نہیں ہے
ہے دل میں جو ارمان تو ہے وہ بھی تمھارا   آ جاؤ کہ اس گھر میں کوئی غیر نہیں ہے
بدلا تو ہے انسان نے دنیائے کہن کو   بدلی ہوئی دنیا میں کوئی خیر نہیں ہے
ہے جوش عمل تم میں تو کافی ہے یہی عمر   دوڑو تو زمانہ بھی سبک سیر نہیں ہے
کھلتا ہے یہاں آ کے ہر اک شخص کا کردار   میخانہ ہے واصفؔ حرم و دیر نہیں ہے

(۱۳۴)

جو کسی رازداں کا جویا ہے   اس نے اپنا وقار کھویا ہے
کیوں جگاتے ہو بخت خفتہ کو   روتے روتے ابھی تو سویا ہے
دل میں ہے آج تک کھٹک پیہم   غم نے کانٹا بھی کیا چبھویا ہے
قتل کے بعد اور یہ دو آنسو   خون کا داغ کس نے دھویا ہے
ہائے واصفؔ کا خون کر ڈالا   کیسا انسان تم نے کھویا ہے

(۱۳۵)

ہجوم جلوہ میں جلوے سے بے نیاز رہے   وہ زندہ دل ہے نظر جسکی پاکباز رہے
سزائے عشق میں دار و رسن نصیب ہوا   خوشا نصیب کہ ہم یوں بھی سرفراز رہے
نہ چھوڑ صبر و قناعت کو بے نوائی میں   غنی وہی ہے جو دنیا سے بے نیاز رہے
سحر قریب ہے انجام آرزو معلوم   شب فراق تری زندگی دراز رہے
غنی کی روح بھی ہوتی ہے کس قدر مسرور   اگر فقیر کا دست طلب دراز رہے

(۱۳۶)

بس اک نظر میں ہی دل دیدیا ہے چل جھوٹے
فریب تو نے بھی اچھا کیا ہے چل جھوٹے
چہ خوش کہ میں نے ترا دل لیا ہے چل جھوٹے
بلا سبب مجھے رسوا کیا ہے چل جھوٹے
کسی نے تیر بھی مارا ہے تیرے سینے میں
نگاہ ناز نے زخمی کیا ہے چل جھوٹے
تمام رات تجھے نیند بھی نہیں آئی؟
ستارے گن کے سویرا کیا ہے چل جھوٹے
کسی کی چاہ میں یوں جان کون دیتا ہے
پیالہ زہر کا تو نے پیا ہے چل جھوٹے
یہ کیسا عشق کہ دم بھر میں جان رخصت ہے
مگر فراق میں برسوں جیا ہے چل جھوٹے
کہا جو اس سے تجھے دل میں رکھ لیا میں نے
کہا کہ دل میں مجھے رکھ لیا ہے چل جھوٹے
کہا کہ دل میں نہیں کوئی اب تو آجاؤ
تو بولے دل میں ترے تخلیہ ہے چل جھوٹے
یہ دخت رز سے ترا اجتناب اے واصفؔ
یہ خوب تو نے ہمیں جُل دیا ہے چل جھوٹے

(۱۳۷)

کیا ہے پروانے کی ہستی اور کیا ہے اس کا ظرف
حسن کی آنکھوں میں آنسو کس سے دیکھا جائے ہے
چوٹ کھاتے ہی شرر ہوتا ہے پیدا سنگ سے
دو جہاں کا غم کہیں پتھر سے کھایا جائے ہے
آؤ واعظ سے ہم اک دستار کا سودا کریں
آہ! اس دنیا میں ظاہر ہی کو دیکھا جائے ہے
اپنی دولت اور حشمت کیا دکھاتا ہے ہمیں
دیکھنا یہ ہے کہ تیرے ساتھ کیا کیا جائے ہے
مشکلات عشق کو آسان کرتا ہے جنوں
اس مصیبت کو بھلا یوں کس سے جھیلا جائے ہے

دشمنوں کی حرف گیری سے نہ ہو واصفؔ ملول
نقد دل بازار رسوائی میں پرکھا جائے ہے

(نوٹ: ردیف محاورۃً متروکہ ہے۔ مگر طرحی غزل ہے اس لئے معذوری ہے۔ واصفؔ)

(۱۳۸)

تری کافر جوانی سے مرا ایماں لرزتا ہے
تب صحرا سے گویا قطرۂ باراں لرزتا ہے
کہانی اپنی کس عنوان سے اسکو سناؤں میں
کہ درد انگیزی مضمون سے عنواں لرزتا ہے
امنگیں تھیں تو دل میں تیرے غم کی میہمانی تھی
مگر اب گھر کو ویراں دیکھ کر مہماں لرزتا ہے
پناہ ساز و ساماں دستِ رعنا ہے تونگر کا
قلندر کے تصرف سے سر و ساماں لرزتا ہے
لطافت میں نسیم صبح سے میں کم نہیں لیکن
مرے نزدیک آکر وہ گل خنداں لرزتا ہے
گداز سوز الفت سے وہ آنسو بن گیا ہوں میں
جو تابِ روئے جاناں سے سر مژگاں لرزتا ہے
بگوش دل سنو ساز وفا کی نغمہ آرائی
ہر اک تار نفس با صدمۂ پنہاں لرزتا ہے
ہوا ہے انس پر مخلوق یہ انسان اے واصفؔ
مگر انسان کو اب دیکھ کر انساں لرزتا ہے

(۱۳۹)

وائے ناکامی کہ وہ مجھ سے کشیدہ ہو گئے
جن سے رونق تھی وہ فتنے آرمیدہ ہو گئے
رائگاں رندوں کے اوصافِ حمیدہ ہو گئے
بوالہوس ان کی نظر میں برگزیدہ ہو گئے
میرے افسانوں سے دنیا نے لیا درس جنوں
میرے افسانے بھی اب تو ناشنیدہ ہو گئے
سرو قدانِ چمن پر آہ! یہ گزری ہے کیا
بارِ آزادی سے شمشیر خمیدہ ہو گئے
بتکدے کی راہ لی تھی چھوڑ کر باب حرم
میری قسمت سے یہ آہو بھی رمیدہ ہو گئے
اک کرن بن کر تری محفل کو گرمائے گا کون
تیرے در سے ہم اگر دامن کشیدہ ہو گئے
قطرہائے خون دل کا کیا کہوں واصفؔ مآل
دفن وہ بھی صورت اشک چکیدہ ہو گئے

(۱۴۰)

فریاد نہیں نغمہ نہیں ساز نہیں ہے
کیفیت دل کی کوئی آواز نہیں ہے
کیا پوچھتے ہو اس نگہ ناز کا عالم
اک نغمہ ہے لیکن کوئی آواز نہیں ہے
اک عمر کے بعد آج بہار آئی ہے لیکن
گل بیز و گہر ریز و چمن ساز نہیں ہے

کہتا ہے قفس میں یہ مرا ذوق اسیری
تھم جا کہ ابھی طاقت پرواز نہیں ہے
یہ عشق ہے واصفؔ یہ چھپائے نہیں چھپتا
تم راز سمجھتے ہو اسے، راز نہیں ہے

(۱۴۱)

عزت انھیں ملی وہی آخر بڑے رہے
جو خاک ہو کے آپ کے در پر پڑے رہے
اے دوست مغتنم ہیں وہ مردانِ باوقار
عسرت میں بھی جو آن پہ اپنی اڑے رہے
پایاب ہو کے سیل نے ان کے قدم لیے
منجدھار میں جو پاؤں جمائے کھڑے رہے
پڑتی نہیں ہر ایک پہ اس کی نگاہ ناز
ساقی کے آستاں پہ ہزاروں پڑے رہے
داغوں سے آبلوں سے مرصع رہا ہے دل
سب کچھ لٹا مگر یہ نگینے جڑے رہے
اپنوں کی تلخ گوئی کی لذت نہ پوچھیے
بھالے سے عمر بھر رگ جاں میں گڑے رہے
مانند سنگ میل دکھائی ہر اک کو راہ
لیکن خود اپنے پاؤں زمیں میں گڑے رہے
ظالم سے ایک بوسے پہ برسوں رہی ہے ضد
آخر تک اپنی بات پہ ہم بھی اڑے رہے
شاید کہ ملتفت ہو کوئی شہسوار ناز
کس آرزو سے ہم سر منزل کھڑے رہے
فتنے بہت ہیں بتکدہ و خانقاہ میں
اچھے رہے جو دشت جنوں میں پڑے رہے

واصفؔ کا انتظار تھا صحرا میں بعد قیس
کانٹے بھی مدتوں یونہیں پیاسے پڑے رہے

(۱۴۲)

مانگو جو مانگنا ہو اپنے ہی رب سے پہلے
دیگا وہی دیا ہے جس نے طلب سے پہلے
بیگانگی مٹا دو بزم طرب سے پہلے
ساغر ذرا لگا دو ناصح کے لب سے پہلے
اے ہم سفر ٹھہر جا عبرت کی کھول آنکھیں
دیکھا تو ہوگا تو نے دلّی کو اب سے پہلے
دستِ سوال کیونکر نکلے گا آستیں سے
نم ہو گئیں ہیں آنکھیں عزم طلب سے پہلے
کچھ تو بتا منجم! کیا پھر بھی وہ ملیں گے
ٹوٹا تھا اک ستارہ آغاز شب سے پہلے
شعر و سخن بھی ہوگا بزم طرب بھی ہوگی
تھم جاؤ بات کر لیں بنت عنب سے پہلے
پہلے سے کیا خبر تھی رسوائی ایسی ہوگی
کیا دن وہ تھا کہ تم کو دیکھا تھا سب سے پہلے
یہ وصل کا زمانہ ہے تیز گام کتنا
آثار ہیں سحر کے انجام شب سے پہلے

واصف کو اب نہ ڈھونڈھو تم کھو چکے یہ دولت
کچھ بھی نہ تم نے سوچا غیظ و غضب سے پہلے

(۱۴۳)

جو خدنگ ناز کے کارواں یونہیں بار بار رواں رہے
تو کہو کہ دل کو کہاں اماں یہ گناہ گار کہاں رہے
کبھی تخت قیصر و تاجِ کے کبھی عشق و رندی و جام مے
یہ تری نگاہ کا فیض ہے رہے باوقار جہاں رہے
ہوا راہ عشق میں سر قلم نہ ہٹایا پیچھے مگر قدم
ترا دم جو بھرتے تھے دم بدم وہ وفا شعار کہاں رہے
یہ سمجھ لے گردش آسماں ترے داؤ پیچ ہیں رائگاں
غم یار دل میں ہے میہماں غم روزگار کہاں رہے
رہے ہم شمار نفس میں گم نہ سنی کہیں سے صدائے قُم
یہ بتاؤ بہر خدا کہ تم شب انتظار کہاں رہے
نہ حزیں ہو واصفؔ خوش نظر جو گئی جوانی تو غم نہ کر
کہ ہے زندگی کا مزہ اگر دل داغدار جواں رہے

(۱۴۴)

بڑا سخت امتحاں ہے آج مؤمن کی فراست کا
کہ بن ٹھن کر تنے بیٹھے ہیں صدر انجمن کتنے
ابھی نکلے نہیں ہیں پیچ و خم زلف برہمن کے
پڑے خاک وطن پر لوٹتے ہیں بے وطن کتنے
یہ غمزے یہ ادائیں اپنی بس رہنے دے اے دنیا
کیے ہیں تو نے شوہر سچ بتا اے پیرزن کتنے
جمال خوبرویاں ضامن ناموس آدم ہے
مگر عشاق ہیں پابند آئین کہن کتنے
ذرا دیکھو تو گوشے سے نکل کر حضرت واصفؔ
مناظر آج ہیں پیش نظر توبہ شکن کتنے

(۱۴۵)

ابھی ایجاد ہونگے دیکھیے طرز سخن کتنے
ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بدلے چلن کتنے
ترے دو چار اشکوں سے ادا کیا خوں بہا ہوگا
بھرے ہیں شمع! جانبازوں کی لاشوں سے لگن کتنے

اگراس نے نظر ہم کو نہ دی ہوتی تو لٹ جاتے
ملے ہیں بھولی بھالی صورتوں میں راہزن کتنے
غنیمت تھی وہی بے آگہی و ابلہی اپنی
خدا جانے جھکولے کھائے گا یہ علم وفن کتنے
کہیں ان چونچلوں سے دولت دیدار ملتی ہے
گریباں چاک دامن چاک دیکھے پیرہن کتنے
چلا ہے لیکے واصفؔ آج لشکر آرزوؤں کا
ہمیں بھی دیکھنا ہے تم ہو آخر صف شکن کتنے

(۱۴۶)

دن کا تجسس راتوں کے نالے کچھ بھی ہمارے کام نہ آئے
بھولا کہیں ہم تم کو نہ کیونکر صبح گئے تھے شام نہ آئے
وقت گزر ہی جاتا ہے آخر بات مگر رہ جاتی ہے دل میں
یاد ہیں وہ بھی دوست ہمیں جو وقت پڑے پر کام نہ آئے
کتنی امیدیں لیکے چلا ہوں اب تو کرم ہو اے مرے ساقی
تیرا وہ در ہے کوئی بھی جائے لوٹ کے وہ ناکام نہ آئے
کاش کہ آئے تجھ پہ ستمگر میری طرح اک غم کا زمانہ
رات وہ جس کی صبح نہ آئے صبح وہ جس کی شام نہ آئے
آج تو واصفؔ ان کو سنادو ایک کہانی عشق و وفا کی
ایسا رہے انداز تکلم حال کھلے اور نام نہ آئے

(۱۴۷)

بیاں اے ہم نشیں غم کی حکایت اور ہو جاتی
ذرا ہم خستہ حالوں کی طبیعت اور ہو جاتی
نصیحت حضرت واعظ کی سنتے بھی تو کیا ہوتا
یہی ہوتا کہ ہم کو ان سے وحشت اور ہو جاتی
بہت اچھا ہوا آنسو نہ نکلے میری آنکھوں سے
بپا محفل میں اک تازہ قیامت اور ہو جاتی
تڑپ کر دل نے منزل پر مجھے چونکا دیا ورنہ
خدا جانے کہ طے کتنی مسافت اور ہو جاتی
تمھارے نام سے ہے بیکسوں کا نام وابستہ
بلا لیتے اگر در پر تو نسبت اور ہو جاتی
بہت سستے رہے نیچی نظر سے دل لیا تم نے
اگر نظریں بھی مل جاتیں تو قیمت اور ہو جاتی
شرف بخشا ہے تم نے آج مجھ کو ہم کلامی کا
کہوں کچھ دل کی بات اتنی اجازت اور ہو جاتی
زہے قسمت نوازا ہے جواب خط سے واصفؔ کو
دکھاتے اک جھلک اتنی عنایت اور ہو جاتی

(۱۴۸)

عاجزی سے خطا مکرم ہے
یہ تنزل عروجِ آدم ہے
آسرا ہے تری توجہ کا
سامنے ہے بھنور تو کیا غم ہے
امڈے آتے ہیں پے بہ پے آنسو
شام فرقت کا خیر مقدم ہے
ہائے بیچارگی اہل وفا
اک زمانے سے آنکھ پرنم ہے
کیا کروں شرح واردات فراق
عشق ہی خود ابھی تو مبہم ہے
ڈھونڈو اشکوں میں مدعا دل کا
میری ہر آرزو مجسم ہے
ساغر دل چھلک گیا واصفؔ
اب تو خطرے میں سارا عالم ہے

(۱۴۹)

حریم ناز کو ہم غیر کی محفل نہیں کہتے
رقیبوں پر مگر وہ کون تھا مائل نہیں کہتے
جو رنج عشق سے فارغ ہو اسکو دل نہیں کہتے
جو موجوں سے نہ ٹکرائے اسے ساحل نہیں کہتے
اشارہ شمع کا سمجھا نہ پروانہ تو کیا سمجھا
منار راہ کو اہل نظر منزل نہیں کہتے
برنگ رشتہ تسبیح دل سے راہ ہے دل کو
بھٹک جائے جو اس جادے سے اسکو دل نہیں کہتے
زلیخا کے وقارِ عشق کو صحرا سے کیا نسبت
جو خود کھنچ کر نہ آجائے اسے منزل نہیں کہتے
مریض غم کی غفلت بھی کمال ہوشیاری ہے
جو گم ہو جائے جلووں میں اسے غافل نہیں کہتے
بھرم اُس کا ہی اے منصور تو نے رکھ لیا ہوتا
کسی کا راز اے ناداں سر محفل نہیں کہتے

(۱۵۰)

تری الفت میں جتنی میری ذلت بڑھتی جاتی ہے
قسم ہے رب عزت کی کہ عزت بڑھتی جاتی ہے
خدایا خیر ہو معمورہائے ربع مسکوں کی
کہ اب دل کھول کر رونے کی عادت بڑھتی جاتی ہے
کسی کو یاد کر کے ایک دن خلوت میں رویا تھا
نہیں معلوم کیوں جب سے ندامت بڑھتی جاتی ہے
کہاں طاقت سنانے کی کسے فرصت ہے سننے کی

کہ مجمل ہوتے ہوتے بھی حکایت بڑھتی جاتی ہے
کہاں میں اور کہاں تیری نگاہ لطف اے ساقی
خدا جانے یہ کیوں مجھ پر عنایت بڑھتی جاتی ہے
یہ میرا شیشۂ دل ہے خزف ریزہ نہیں ہمدم
شکستہ جس قدر ہوتا ہے قیمت بڑھتی جاتی ہے
ادھر تحسین آرائش کی خواہش حسن خود بیں کو
یہاں جذبات پنہاں کی حفاظت بڑھتی جاتی ہے
غضب کا جذب ہے واصفؔ نگاہِ مست میں اس کی
منازل قطع ہوتے ہیں عزیمت بڑھتی جاتی ہے (۱۹۴۴ء)

(۱۵۱)

وجہ وفور کلفت احساس و آگہی ہے
اس آگہی کے ہاتھوں کیا جان پر بنی ہے
گو بزم آرزو پر طاری فسردگی ہے
سینے میں اب بھی لیکن اک آگ سی لگی ہے
اے عشق خانہ ویراں تیری تباہ کاری
مرنے کی آرزو تھی اب وہ بھی مٹ رہی ہے
محفل میں آکے ہنسنا خلوت میں جا کے رونا
اس زندگی میں ہم پر کیا کیا گزر گئی ہے
ضبط فغاں بھی ممکن صرف نظر بھی آساں
دل کا معاملہ ہے مشکل یہ آپڑی ہے
تنکے کا بھی سہارا دل کو نہیں گوارا
گو زندگی کی کشتی گرداب میں پھنسی ہے
باقی ہے بعد مردن رسوائی محبت
مجھ بے نشاں پہ اب بھی بہتان زندگی ہے
واصفؔ سے آبرو تھی دنیائے عاشقی کی
مدت ہوئی کہ ان کی محفل میں برہمی ہے

(۱۵۲)

روح جب قید عناصر میں گرفتار نہ تھی
گرمی بزم نہ تھی رونق بازار نہ تھی
آپ کے وعدہ کا شاید مجھے آجائے یقیں
تیز اتنی تو کبھی قلب کی رفتار نہ تھی
جستجو میں تری پہنچا میں عدم تک ایدوست
ورنہ یہ زیست کچھ ایسی بھی گرانبار نہ تھی
اللہ اللہ بلندئ مذاق عصیاں
غیر آدم کوئی مخلوق گنہ گار نہ تھی
انکو جی بھر کے نہ دیکھا کہ ہوئی صبح فراق
اس قدر تیز کبھی وقت کی رفتار نہ تھی

جسم خاکی نے دیا ساتھ نہ میرا اے دوست   جستجو تیری رہ شوق میں دشوار نہ تھی
بزم دوشیں کا سماں واصف غمگیں سے نہ پوچھ
کون سی آنکھ تھی جو مہبط انوار نہ تھی

(۱۵۳)

آگ حرمانگہ عالم میں لگا دے ساقی   یک قلم دفتر ارماں کو جلا دے ساقی
توڑ دے جام و سبو بادہ لنڈھا دے ساقی   آج تو رخ سے نقاب اپنے اٹھا دے ساقی
مے کی تلخی میں حلاوت بھی ملا دے ساقی   میٹھا میٹھا سا کوئی بول سنا دے ساقی
اجنبیت سے مکدر ہے مزاج محفل   لب سے ناصح کے ذرا جام لگا دے ساقی
عقل کم مایہ کجا راہ خرابات کجا   میری ہستی سے یہ بہتان ہٹا دے ساقی
تلخ سے تلخ پلا اور پلا خوب پلا   ایسی جو ہوش فرشتوں کے اڑا دے ساقی
غیرت نشۂ الفت کو گلہ ہے تجھ سے   فتنہ گردش دوراں سے بچا دے ساقی
بجھ نہ جائے کہیں دل صدمۂ ناکامی سے   خون میں آتش سیال کھپا دے ساقی
ظرف و تمکین بھی تجھ سے ہے تجھی سے توفیق
لطف تو جب ہے کہ واصف کو چھکا دے ساقی

(۱۵۴)

خدا جانے یہ پیہم کون نشتر سے چبھوتا ہے   خوشی کے وقت بھی دل میں ہمارے درد ہوتا ہے
کوئی اس گوشۂ دیوار کی عظمت کو کیا جانے   جہاں کوئی کسی کی یاد میں چھپ چھپ کے روتا ہے
کلی تو مسکرا کر راز پنہاں کھول دیتی ہے   مگر کیا بات ہے دل کی نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے
نہ بولو مجھ سے لیکن کیا مجھے دل سے بھلا دو گے   کسی کی یاد مٹ جائے کہیں ایسا بھی ہوتا ہے
ستاروں سے لڑی رہتی ہے واصف کی نظر پیہم   یہ کس مہوش کی گردن کیلئے موتی پروتا ہے

(۱۵۵)

الفت میں جان و دل کا زیاں دیکھتے رہے   پھر بھی اسی میں راحت جاں دیکھتے رہے
لٹتا رہا یہ گلشن ایماں تمام عمر   ہم شیوۂ سکوت بتاں دیکھتے رہے

ناگاہ ان کا تیر نظر دل کے پار تھا
ہم بیخودی میں تاب کماں دیکھتے رہے
شرط وفا یہ تھی کہ مٹاتے خود اپنا نام
واصفؔ ہم ان کا نام ونشاں دیکھتے رہے

(۱۵۶)

ہم کو آزادی میں حاصل ہے اسیری کا مزہ
قیدِ پاسِ وضع اور بندِ سلاسل ایک ہے
یوں تو محفل میں ہزاروں ہیں مقرب جانثار
دل اگر سچ پوچھتے ہو تم پہ مائل ایک ہے
کیا عنایت کیا اذیت کیا محبت کیا عناد
بحرِ غم میں موجۂ وگرداب وساحل ایک ہے
اٹھ گئے کیا حضرت سائلؔ کہ دلّی لٹ گئی
ٹوٹ پڑنا چرخ کا اور مرگ سائلؔ ایک ہے
سنکے واصفؔ کی غزل کہنے لگے ارباب ذوق
آج محفل میں غزل سننے کے قابل ایک ہے

(۱۵۷)

گئے جب سے روٹھ کے مجھ سے تم نہ سکون ہے نہ قرار ہے
کسی مست عیش ونشاط کو کوئی کاش جاکے پیام دے
کہ یہاں بھی موج نسیم ہے گل ومل ہے ابر بہار ہے
نہ اٹھے گا تجھ سے یہ بارِ غم کہ یہ میرے دل کا ہی کام تھا
ترے غم نے پھونک دیا مگر وہی شان ضبط وقرار ہے
کبھی پست نہ کر سکے مجھے یہ جفائے دہر کے زلزلے
وہی آن ہے وہی عزم ہے وہی پاس عز و وقار ہے
دل و جان و عزت و آبرو رہ امتحاں میں لٹا دیئے
یہ کہو کہ اور میں کیا کروں اگر اب بھی دل میں غبار ہے
جو کبھی گزر ہو سوئے عرب تو صبا یہ کہنا بصد ادب
کہ گناہگار تو ہے مگر یہ ترا ہی واصفؔ زار ہے

(۱۵۸)

جب میری محبت اسے معلوم ہوئی تھی
پلکوں میں بس اک لرزش موہوم ہوئی تھی
ساقی نے جو بھولے سے مرا نام لیا تھا
کس درجہ حریفوں میں مری دھوم ہوئی تھی
لکھی گئی سرخی دل مضطر کے لہو سے
جب لوح پہ قسمت مری مرقوم ہوئی تھی

جب تجھ کو ازل میں دل بیدرد ملا تھا
اک آہِ فسردہ مجھے مقسوم ہوئی تھی
کام آگیا دل رزمگہ عشق و وفا میں
اف کیا ہی وہ اک لغزشِ معصوم ہوئی تھی
دلّی کا جو یہ رنگ فلک نے ہے دکھایا
ایسی نہ کبھی دہلیِ مرحوم ہوئی تھی
کیا خوب ہے واصفؔ ترا میخانے میں آنا
بن تیرے طبیعت مری مغموم ہوئی تھی

(۱۵۹)

کہاں فرصت کہ رفتار جہاں کچھ اور کہتی ہے
گلے مل لو کہ بانگ کارواں کچھ اور کہتی ہے
غنیمت ہیں یہ لمحے اور کچھ ہنس بول لو یارو!
سکوتِ شب میں فطرت کی اذاں کچھ اور کہتی ہے
سکونِ بحر سے اے ناخدا دھوکا نہ کھا جانا
سبک رفتاریٔ موج رواں کچھ اور کہتی ہے
بڑے صبر و تحمل سے چھپایا تھا محبت کو
مگر واصفؔ نگاہِ دوستاں کچھ اور کہتی ہے

(۱۶۰)

ہم نے سمجھا تھا جنھیں دوست وہ دشمن نکلے
سیدھا سادہ جنھیں سمجھا تھا وہ پرفن نکلے
رازداں جن کو بنایا وہی غماز بنے
جن کو ٹھہرایا تھا رہبر وہی رہزن نکلے
جن کا ہر لفظ تھا اسرار و حکم کا حامل
امتحانگاہِ وفا میں وہی کودن نکلے
جن سے ہم صاف دلی سادہ مزاجی سے ملے
ان کے سینے حسد و کبر کے مخزن نکلے
میرا ہر شکوہ وہاں غیر مدلل ٹھیرا
ان کے الزام تھے جتنے وہ مبرہن نکلے
ان کا ہر قول و عمل لائق تعریف رہا
اک ہمیں تھے جو وہاں درخور کشتن نکلے
جن عزیزوں سے تھی احسان و کرم کی امید
میری جانب سے بچاتے ہوئے دامن نکلے
نفس کے پھندوں سے اب کون چھڑائے ہم کو
شیخ و واعظ تو گرفتار برہمن نکلے
چار تنکے بھی میسر نہ ہوئے گلشن میں
ہم جو واصفؔ پئے تعمیر نشیمن نکلے

(۱۶۱)

نہ پوچھ اے ہم نشیں لمحات رفتہ انکی محفل کے
کہ اب مجھ کو نہیں ہیں یاد اکثر حادثے دل کے
سفینہ اقتدار و حریت کا کچھ گراں نکلا
تنک آبی سے ڈوبے آکے ہم نزدیک ساحل کے
سفر آساں نہیں اے ہمدمو! راہ محبت کا
کوئی پہنچا سر منزل تو پہنچا خاک میں مل کے
بجائے رنگ و بو شعلے بھرے تھے غنچے غنچے میں
گلوں نے راز گلشن آشکارا کر دیا کھل کے

بری ہو تو گئے محشر میں ہم لیکن تردد ہے
کہ جائیں خلد میں کیونکر بغیر اپنے مقابل کے
ہوئی مدت مگر دل سے وہ اک نقشہ نہیں مٹتا
دم رخصت بہائے تھے جو آنسو تم نے مل مل کے
رلاؤ جس قدر چاہو ہمیں لیکن یہی آنسو
نہ ہو جائیں کہیں تخم بغاوت خاک میں مل کے
نہیں ملتے وہ جب تک صبر کر لیتا ہوں اے واصفؔ
وہ کیسا وقت ہو گا جب جدا ہو جائیں گے مل کے

(۱۶۲)

کیا ہو فتنہ بپا خدا جانے
آج اس نے نظر ملائی ہے
بات اپنی ہے دل میں جب تک ہے
مونھ سے نکلی تو پھر پرائی ہے
تم نے کیا کچھ کہا نہیں ہم کو
ہم جو بولیں تو بس لڑائی ہے
کوئی حامی نہیں فقیروں کا
آہ کیا شان کبریائی ہے
نوش کی مستحق ہے مور حقیر
درخور نیش اپنا بھائی ہے
ہوگی رسی اب اور کتنی دراز؟
اور دو دن کی یہ خدائی ہے
اے خوشا داستان خیر امم
زندگی جان دے کے پائی ہے
خاک و خوں سے ہے آبرو یارو!
یوں ہی اوپر سے ہوتی آئی ہے
آؤ دیکھو تباہیاں دل کی
کیا قیامت غموں نے ڈھائی ہے
ہم نے مانا کہ دل نہیں ملتا
بات کرنے میں کیا برائی ہے
پھر یہ موقع کبھی ملے نہ ملے
گفتگو ہم نے خود بڑھائی ہے
بدگماں کیوں ہوئے ہو واصفؔ سے
دشمنوں نے یونہی اڑائی ہے

(۱۶۳)

عجیب روگ ہمیں عشق نے لگایا ہے
کہ پہروں روئے ہیں جب کوئی یاد آیا ہے
حریم دل میں چراغاں ہے آرزوؤں کا
تمھارے واسطے ہم نے یہ گھر سجایا ہے
ہمارے بخت کی ظلمت میں کچھ کمی نہ ہوئی
اگرچہ دل کا دیا مدتوں جلایا ہے
نہ شعلہ ہے نہ دھواں ہے نہ آنکھ میں آنسو
کچھ ایسا تیرے تغافل نے جی جلایا ہے

خدا کے واسطے کچھ تو ہی مدد کر اے یاس
کہ آس نے تو ہمیں رات بھر جگایا ہے
نہیں ہے ہم پہ عنایت تری مگر اے دوست
ہمیشہ نام ترا سن کے سر جھکایا ہے
قفس سے چھوٹ کے بیشک خوشی ہوئی تھی ہمیں
اسی خوشی نے ہمیں آج تک رُلایا ہے
گناہگار تو ہیں ہم مگر تمھارا نام
کتاب حق میں غفورٌ رَّحیم آیا ہے
بایں مذلت و خواری کبھی تمھارے سوا
کسی کے در پہ جبیں کو نہیں جھکایا ہے
کہاں وہ رفعت گردوں کہاں یہ پستیٔ خاک
فلک نے آہ کہاں سے کہاں گرایا ہے
ستم کی ناؤ ابھی بھر نہیں چکی شاید
یہاں کلیجہ غریبوں کا مونھ کا آیا ہے

(۱۶۴)

کسک دل کی نہیں جاتی اذیت کم نہیں ہوتی
یہ ایسا ابتلا ہے جس کی مدت کم نہیں ہوتی
کسی صورت سے غم کھانے کی عادت کم نہیں ہوتی
مسرت میں بھی دل سے غم کی لذت کم نہیں ہوتی
اِدھر چاہت ہی چاہت ہے یہ چاہت کم نہیں ہوتی
اُدھر نفرت ہی نفرت ہے یہ نفرت کم نہیں ہوتی
ہزاروں بار ہم تو خوب توبہ کر چکے لیکن
محبت پھر محبت ہے محبت کم نہیں ہوتی
چراغ آرزو سینے میں اک مدت سے روشن ہے
مگر تاریکیٔ شبہائے فرقت کم نہیں ہوتی
بھڑاس اس شوخ کے دل کی نکل جائے تو اچھا ہے
کسی کی گالیوں سے اپنے عزت کم نہیں ہوتی
وفا کے شوق میں ایماں سے بھی ہم ہاتھ دھو بیٹھے
مگر اس فتنہ پرور کی رعونت کم نہیں ہوتی
نہ ہو مایوس اے واصفؔ اگر تو دل شکستہ ہے
شکستہ ہو کے اس شیشے کی قیمت کم نہیں ہوتی

(۱۶۵)

جفا جو سے محبت آفریں سے   محبت ہے مجھے اک نازنیں سے
کوئی کہد و محبت کے امیں سے   نہ نکلے آہ بھی قلب حزیں سے
فلک کیا جانے قیمت عاشقوں کی   ہمارا مرتبہ پوچھو زمیں سے
الٰہی خیر ہو جذبات دل کی   بھڑک اٹھیں نہ آہ آتشیں سے
اڑا جاتا ہے دل بھی روح کیساتھ   تری آواز آتی ہے کہیں سے
یہ ناموس وفا ہے آہ کیونکر   اٹھاؤں اشک خونیں کو زمیں سے
یہ کہتی ہے تڑپ واصفؔ کے دل کی   ملے گا کھوج منزل کا یہیں سے

(۱۶۶)

دل پہلے پہل مجھ سے لگایا ہے کسی نے   یوں زیست کا اک راز بتایا ہے کسی نے
گیت اپنی محبت کا سنایا ہے کسی نے   نغمات کی لہروں میں بہایا ہے کسی نے
پردہ رخ تاباں سے ہٹایا ہے کسی نے   سوئے ہوئے فتنوں کو جگایا ہے کسی نے
مخمور نگاہیں ہیں قیامت کی نگاہیں   جذبات میں طوفان اٹھایا ہے کسی نے
مجبور فنا خرمن تمکین و خرد ہے   بجلی کی طرح اشک گرایا ہے کسی نے
الفت کی ہے اک طرز میں تاریخ مکمل   پیمان وفا یاد دلایا ہے کسی نے
واصفؔ وہ مجھے یاد ہے انداز تغافل   نالوں میں اثر دے کے رلایا ہے کسی نے

(۱۶۷)

یہ خونِ تمنا کہ تو مستور ہے مجھ سے   یہ جبر محبت کہ تو رنجور ہے مجھ سے
پڑتی ہے رقیبوں پہ بانداز توجہ   وہ اک نگہ ناز کہ معذور ہے مجھ سے
ہے جور فلک عشق کی فطرت کا تقاضا   یہ گردش ایام بھی مجبور ہے مجھ سے
زندہ رہوں اور جھیلوں جدائی کی اذیت   یہ حوصلہ اس کو ابھی منظور ہے مجھ سے
ہر لمحہ سمجھتا ہوں کہ سرحد پہ قدم ہے   اور منزل مقصود ابھی دور ہے مجھ سے
یہ کارگہ دہر کہ ہے مجمع اضداد   ہے اس میں مسرت بھی مگر دور ہے مجھ سے
واصفؔ نہیں آسان محبت کا چھپانا   قائم کوئی دن اور یہ دستور ہے مجھ سے

(۱۶۸)

ہے دیدنی کشاکش پنہان زندگی
امکان مرگ ہے کبھی سامان زندگی
یہ سادگی عشق ہے یا ہے فریب نفس
مر کر بھی کر رہا ہوں میں اعلان زندگی
بے تاب کوئی راز ہے اظہار کے لئے
بدلا ہوا سا آج ہے عنوان زندگی
اب تو قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رہی
طے ہوگا کس طرح یہ بیابان زندگی
باران اشک نے اسے واصفؔ مٹا دیا
لکھا تھا خون دل سے جو عنوان زندگی

(۱۶۹)

نسیم صبح یوں لے کر ترا پیغام آتی ہے
پری جیسے کوئی ہاتھوں میں لیکر جام آتی ہے
وہ منظر بھی کبھی دیکھا ہے اہل کارواں تم نے
امنڈ کر جب کسی بچھڑے ہوئے پر شام آتی ہے
یہاں اب ناتوانی سے قدم بھی اٹھ نہیں سکتے
اُدھر محفل سے ساقی کی صلائے عام آتی ہے
کسی کا خون دل کھنچ کر ٹپک جاتا ہے آنکھوں سے
کسی کی آنکھ میں کھنچ کر مئے گل فام آتی ہے
مقدر کا ستارہ گر نہو رخشندہ اے واصفؔ
نہ ہمت ساتھ دیتی ہے نہ حکمت کام آتی ہے

(۱۷۰)

کارواں آنکھوں سے اوجھل اور محمل دور ہے
ہاں قدم آگے بڑھا اے دل کہ منزل دور ہے
لے خبر دزدان مسجد کی یہ کافی ہے تجھے
محتسب آگے نہ جا رندوں کی محفل دور ہے
کیا ہی درد انگیز ہے یہ منظر امید و بیم
بے ہنر ہیں اہل کشتی اور ساحل دور ہے
سائلؔ شیریں سخن کی پیروی کرتے ہو تم
لیکن اے واصفؔ مقام فضل سائلؔ دور ہے

(۱۷۱)

رہی کچھ ایسی معزز کہ ہاتھوں ہات گئی
کہاں سے چل کے کہاں تک ہماری بات گئی
چمن میں آکے ہمیں کس نے کر دیا رسوا
اڑائی ایسی ہوائی کہ پات پات گئی
فسانۂ غم ہجراں تمام ہو نہ سکا
تلاش لفظ و عبارت میں ساری رات گئی
کریں گے اب تو زمانے کی ناز برداری
وہ بات جس پہ ہمیں ناز تھا وہ بات گئی
متاع تھی مری جو کچھ وہ اک یہی دل تھا
گیا جو دل تو مری ساری کائنات گئی

(۱۷۲)

یہ مانتا ہوں تحمل میں کچھ ثواب تو ہے
مگر یہ صبر مسلسل بھی اک عذاب تو ہے
دعائے نیم شبی میری مستجاب تو ہے
مزاج حسن میں کچھ آج انقلاب تو ہے
زہے نصیب اگر یوں وہ دل نواز رہے
جواب تلخ سہی لذت خطاب تو ہے
خبر ہوئی انھیں اپنے شباب کی شاید
کچھ آجکل انھیں واصفؔ سے اجتناب تو ہے

(۱۷۳)

نزدیک سا ہوا ہے کچھ دور سا ہوا ہے
کیونکر کہوں کہ وہ بت مغرور سا ہوا ہے
یہ ہمدموں کی نظریں یہ چشمکیں اشارے
راز نہاں ہمارا مشہور سا ہوا ہے
دم بھر میں طے کیے تھے جس نے یہ کوہ وصحرا
وہ اشہب عزیمت رنجور سا ہوا ہے
کل میری بات سن کر اس نے نظر جھکالی
ہمدم! سوال میرا منظور سا ہوا ہے
تابانیوں سے جس کی عالم ہوا منور
اب وہ چراغ جادہ بے نور سا ہوا ہے
اے دوستو! مرا دل بھولا نہیں ہے تم کو
عشق بتاں کے ہاتھوں مجبور سا ہوا ہے
دیکھو تو اس کا دل ہے کتنا ستم رسیدہ
محفل میں جو بظاہر مسرور سا ہوا ہے
تھی جسکے دم سے رونق رسوائے خلق واصفؔ
جور فلک کے ہاتھوں معذور سا ہوا ہے

(۱۷۴)

عداوت سہتے سہتے دل میں نفرت آہی جاتی ہے
زباں پر شدت غم میں شکایت آہی جاتی ہے
خدا جب مال دیتا ہے رعونت آہی جاتی ہے
حکومت ہاتھ آتی ہے تو نخوت آہی جاتی ہے
مرا دل کس قدر دکھا ہوا ہے کہہ نہیں سکتا
مگر ملتی ہیں جب نظریں محبت آہی جاتی ہے
ابھی دیکھا نہیں ہے تو نے اس کا جلوہ اے ناصح
کہوں کیا اچھی صورت پر طبیعت آہی جاتی ہے
زبانِ شیخ حق گوئی میں ہے تیغِ دو دم لیکن

حضورِ اہل ثروت اس میں لکنت آہی جاتی ہے
خلوص اہل دل ہے رائگاں ناحق شناسوں میں
بایں صدق وصفا خطرے میں عزت آہی جاتی ہے
جناب شیخ کے غصے کی واصفؔ تو نہ کر پروا
اگر ہو تربیت ناقص جہالت آہی جاتی ہے

(۱۷۵)

ماضی کے تصور سے کہو پاس نہ آئے   تنہا مجھے رہنے دے ابھی کام بہت ہے
تم جس کو نوازو وہ برا ہو نہیں سکتا   مجھ پر تو بس اک زیست کا الزام بہت ہے
اے کاش ٹھٹک جائے ذرا ناقۂ لیلیٰ   دیوانے کو بس وقفۂ یک گام بہت ہے
دنیا کی روش موجب افسوس ہے لیکن   دامن کشیٔ خلق میں آرام بہت ہے
کل آنے کا وعدہ ہے زہے خوبی قسمت   لیکن تری اس کل میں تو ابہام بہت ہے
اچھا ہے نہ پہنچے جو انھیں میری کوئی بات   واصفؔ کو وہ کہتے ہیں کہ گمنام بہت ہے

(۱۷۶)

(تضمین بر غزل خواجہ میر دردؒ)

خیر و شر کی کشمکش میں مر چلے   حسرتوں سے اپنا دامن بھر چلے
بار عصیاں دوش پر لے کر چلے   تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے

آرزوؤں کا محل ویران ہے   مضطرب دل مخمصے میں جان ہے
زندگی کی کیا یہی پہچان ہے   زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس چمن میں کس کو دائم ہے بقا   دو گھڑی کی زیست ہے آخر فنا
جتنے چاہے آ کے تو غنچے کھلا   کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر اودھر چلے

جان ہر دم مبتلائے پیش و پس   چین دل نے بھی نہ پایا یک نفس

تاک میں بیٹھا ہے ابتک بوالہوس　　دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تواپنے گھر چلے
وقف گردو پیش ہوں ویسا ہی دوست　　میں تحمل کیش ہوں ویسا ہی دوست
اک جرحِ نیش ہوں ویسا ہی دوست　　ایک میں دل ریش ہو ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے
ہم نے جب رکھا قدم اس بزم میں　　ہر طرف تھا غم ہی غم اس بزم میں
لٹ گیا اپنا بھرم اس بزم میں　　شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
مدتوں بیکار اتنے دکھ بھرے　　جستجو کی کلفتوں میں کیوں مرے
وہ تو حاضر ہے رگ جاں سے ورے　　ڈھونڈھتے ہیں آپ سے اسکو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے
کیا کہیں کیا گزری ہم پر آپ سے　　دل تو چل نکلا ہے اکثر آپ سے
خود چلے پھر آئے کھنچ کر آپ سے　　ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے
کس قدر ناز و نعم میں ہم پلے　　داغ تھا دل میں نہ کوئی ولولے
تھے غم الفت سے فارغ حوصلے　　ہم جہاں میں آئے تھے تنہا و لے
ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے
اک ظہور جلوہ تھا مقصود یاں　　یک بیک لا کر کیا موجود یاں
کیا ہے اپنی فطرت بیسود یاں　　جوں شرر ہے ہستی بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ایک دن ہونا ہے آخر چھٹ چھٹاؤ　　دو گھڑی کا بس غنیمت ہے بناؤ
حق بنا رکھے یہ تیرا رکھ رکھاؤ　　ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
اک تماشا تھا یہ سب عیش و طرب　　مختصر تھے کس قدر لمحات شب

کیا کہے واصف کہ ہے جائے ادب   درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

فَاعْتَبِرُوا

ایک بچے کی طرف گزرے امام اعظمؒ   راہ میں دوڑ رہا تھا وہ بجہل و غفلت
آپ نے اس سے کہا پانو سنبھل کر رکھو   کپڑے کیچڑ میں نہو جائیں تمھارے لت پت
سن کے یہ کودک ناداں نے دیا انکو جواب   مجھ سے کیا کہتے ہیں آپ اپنی خبر لیں حضرت
میں جو پھسلوں گا تو پہنچے گی مجھی کو تکلیف
آپ پھسلیں گے تو گر جائے گی ساری امت

(یہ ۱۹۷۷ء کا کہا ہوا غیر مطبوعہ قطعہ ہے جو مولانا کی بیاض سے نقل کیا گیا۔ قاسم دہلوی)

***

نعت

بالا تر از قیاس ہے عظمت رسول کی
تفسیر اسم ذات ہے بعثت رسول کی
سرچشمۂ حیات سیاست رسول کی
دستور کائنات ہدایت رسول کی
خیر الامم ہے اس لئے امت رسول کی
ہے مظہر کمال رسالت رسول کی
لا تایْئَسُوا کی شان ہے خلق عظیم میں
لا تَقْنَطُوا کی شرح شفاعت رسول کی
مبہوت آج تک ہیں فصاحت کے مدعی
عالم پہ چھا گئی ہے فصاحت رسول کی
دل انکے پاکباز تھے روحیں تھیں خوش نصیب
جن کو ہوئی نصیب رفاقت رسول کی
دنیا ہی اس کے دل کی یکایک بدل گئی
جس پر پڑی ہے چشم عنایت رسول کی
نامعتبر ہے دعوئ توحید دوستو!
تسلیم اگر نہیں ہے وضاحت رسول کی
راہ طلب میں خوب خرد کے دیئے جلاؤ
لیکن بہر قدم ہے ضرورت رسول کی
مانا کہ تجھ کو پیار ہے اپنے رسول سے
یارب ذلیل کیوں ہے یہ امت رسول کی
سینے سے میرے دل کو فرشتو! نکال لو
کیونکر سقر میں جائے گی الفت رسول کی
مجرم ہوں میرا نامۂ اعمال ہے سیاہ
حاصل تو ہے مگر مجھے نسبت رسول کی

واصفؔ اگر نہیں ہے تمھیں تاب انتظار
خود کو مٹا کے دیکھ لو صورت رسول کی

نظموں کا انتخاب

دہلی مرحوم ۱۹۲۹ء

اے جہان آباد اے معمورۂ علم و حکم   اے بہارستان ہند اے مرجع روم و عجم
خوابگاہ راحت شاہان اسکندر حشم   پردہ گاہ حسن فطرت غیرت باغ ارم
آہ! کیا دن تھے کہ تو علم و ادب کا مہد تھا
عافیت خوشحالی و عیش و طرب کا عہد تھا
یادگار سطوت غرناطہ و بابل ہے تو   بحر تہذیب و تمدن کے لئے ساحل ہے تو
دل اگر ہندوستاں ہے تو سواد دل ہے تو   روئے پر نور جہاں پر ایک زیبا تل ہے تو
تیری ہستی رازدار عظمت دیرینہ ہے
ہر ادا سے تیری ظاہر شوکت دیرینہ ہے
حیف اے منزل گہ صولت نشان رفتگان   تھا کبھی فخر جہاں اے بوستان رفتگاں
تیرے ذروں میں نہاں ہے عز و شان رفتگاں   تجھ میں خوابیدہ غبار کاروان رفتگاں
تھا تو ہی شمع تمدن بزم فطرت کے لئے
تیری ہستی مایۂ نازش تھی ملت کے لئے
تھا علاء الدین خلجی کا جلالت گاہ تو   بابر و صاحبقراں کا تھا مہابت گاہ تو
دودمان مغلیہ کا تھا وجاہت گاہ تو   آہ! لیکن آج ہے ان سب کی تربت گاہ تو
تو ہی جولانگاہِ شاہنشاہِ عالمگیر تھا
خوابِ رفعتہائے یوناں کی تو ہی تعبیر تھا
تجھ میں اکبر لے کے آیا تھا جلال خسروی   مظہر فر شہاب الدین اعظم تھا تو ہی
اے دمشق ہند اب وہ تیری دولت کیا ہوئی   کیوں مے عرفاں کے مستوں سے ہے میخانہ تہی
عدل سے اخلاق سے آباد تھی محفل تری
جلوہ گاہ عظمت بغداد تھی محفل تری
مرجع اہل کمال و مخزن شعر و سخن   سیر گاہ اہل دل زہد و سماحت کا چمن

مرکز خلق و مروت اور شجاعت کا وطن   کشت زار آرزوہائے سلاطین کہن
تیرے فاتح کیا ہوئے وہ تیرے والی ہیں کہاں
جن سے تو گلشن بنا تھا اب وہ مالی ہیں کہاں

اے جہان آباد اے گہوارۂ دین متیں   تھا کبھی تو مہبط انوار رب العالمیں
بارگاہ خاص تھی ہمدوش فردوس بریں   تھی زمانے کی عقیدت گاہ تیری سرزمیں
ہے تو ہی ماویٰ و مرکز حادثات دہر کا
ساحل خوددار ہے تو آفتوں کی لہر کا

عبرت افروز اور حسرت زا ہیں ویرانے ترے   نوحہ گر ہیں تیری بربادی پہ کاشانے ترے
آج ساقی ہے گل و مل ہے نہ میخانے ترے   تو ہی فرما کسطرف جائیں یہ دیوانے ترے
تیری تاریخ کہن پہروں رلاتی ہے ہمیں
پھر وہی جمعیت دل یاد آتی ہے ہمیں

اب نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں تیری بزم ناز کو   کان اب سنتے نہیں تیری نوائے راز کو
دل ترستا ہے ترے ہنگاموں کی آواز کو   کونسے پردیمیں ڈھونڈھوں میں ترے اس ساز کو
بزمگاہ بیکسی ہے پرسکوں منظر ترا
خون ارماں سے لبالب شیشہ و ساغر ترا

کیا ہوا جو جنبش لب پر ترا اعجاز تھا   حکمت و ارشاد جس پر قدسیوں کو ناز تھا
خاک میں ملنے پہ بھی باقی ہے جو اعزاز تھا   تیری بربادی کا یہ بھی اک نیا انداز تھا
آج تک ہے نام تیرا لذت کام و دہاں
آستاں تیری ہے ابتک روکش ہفت آسماں

پھر سے گڑ جائے جہاں پر تیری عزت کا علم   کاش دیرینہ تری عظمت ہو تو ہو اور ہم
شان پہلی سی ہو تجھ میں پھر بنے رشک ارم   دیکھ لیں آنکھوں سے اپنی ہم ترا جاہ و حشم
سامنے آنکھوں کے آجائیں وہ پہلی شوکتیں
دیکھ لے پھر سے جہاں تیری پرانی شوکتیں

اے کہ تھا سارے جہاں کو فخر تیری خاک پر   تذکرہ تیرا ملائک میں بھی تھا افلاک پر

روہی ہے آج حسرت تیری ارض پاک پر   بیکسی چھائی ہوئی ہے دیدۂ نمناک پر
ذرہ ذرہ میں جھلکتا ہے گذشتوں کا لہو
آتی ہے تیرے گلوں میں آج بھی پہلوں کی بو

آج پھر جوش جنوں آوارہ محفل میں ہے   پے بہ پے تابندگی پھر داغہائے دل میں ہے
تازگی عزم و ہمت عازم منزل میں ہے   آنکھ سے اوجھل ہے جو لیلیٰ اسی محمل میں ہے
دفن ہیں اسلاف تیری خاک گوہر پوش میں
ناز ہے جن پر تجھے وہ ہیں ترے آغوش میں

ہم نشیں چشم بصیرت کھول اس پستی کو دیکھ   اور پھر اپنی مئے غفلت کی بدمستی کو دیکھ
دیکھ پُر لعل و گہر گنجینۂ ہستی کو دیکھ   ہے اسی میں سب کچھ اس اجڑی ہوئی بستی کو دیکھ
ہے فضا رخشندہ واصف کوکب امید سے
یہ چمن پھر بھی کھلے گا نغمہ توحید سے

قطب مینار

اے قطب مینار اے خمیازۂ دورِ شباب   اے نقیبِ حریت اے یادگارِ انقلاب
دیکھ کر تجھ کو یہ کہتا ہے فلک پیما عقاب   اَیُّہا الاَرواحُ حَیُّوا ذٰلِک شیئٌ عُجَاب
ارتقائے عشرتِ فانی کی معراج حسیں   کشورِ صنعت کا تو شہزادۂ گردوں طناب
تیری ہستی حامل تاریخ آثارِ کہن   تو نے دیکھا فاتحوں کا اوج قوموں کا شباب
شاہراہِ زندگی کا ہے نشانِ رہ نما   یا کوئی سرکش فرشتہ آگیا زیر عتاب
یا ملائک کے اترنے کیلئے زینہ ہے تو   یا ہے چرخ بے ستوں کا اک ستون دیریاب
یا مسافر جو بچھڑ کر کارواں سے رہ گیا   کر رہی ہو جس سے کچھ سرگوشیاں حور سحاب
یا چلی آتی ہے اک امڈی ہوئی موج مہیب   یا مئے دوشیں سے کوئی دیوتا مست و خراب
مظہر کر و فر شاہنشہی تیری فضا   تیری خاموشی میں ہے ہنگامہ صد انقلاب
دشتِ امکاں میں بگولہ اٹھ کے قائم ہو گیا   گردشوں کی فوج بے پایاں ہے جسکے ہمرکاب
سروِ آزاد اس گلستانِ خزاں دیدہ کا ہے   مطرب فطرت کا ہے یا ایک گم گشتہ رباب

تیری عظمت سے لجاتا ہے عروج ماہِ تام   تیری ہیبت سے لرزتا ہے طلوع آفتاب
سربلندی ہے تری بالاتر از وہم و خیال   ساکنان چرخ کو ہے تیری شوکت سے حجاب
یوں قد بالا نظر آتا ہے تیرا دور سے   جیسے ہوا یمن میں اپنے رب سے موسیٰ ہم خطاب
تیری پہنائی میں پنہاں قوت اسلام ہے
تیری رفعت یادگار رفعت ایام ہے

شاہجہان آباد اور انقلاب ۱۹۴۷ء

سن اے ستارۂ صبح وطن مری روداد   سن اے بہار دلِ زخم خوردہ کی فریاد
شکایت الم سرد مہریٔ یاراں   حکایت غم ویرانیٔ جہان آباد
سواد منزل الفت نظر نہ آیا تھا   کہ خاک وخوں میں ہوئی غرق محنت فرہاد
یہ خاک خطہ دہلی کہ جس کا چشمہ فیض   رسیدہ تا بہ بخارا و کابل و بغداد
پھر آج خون مسلماں سے ہو گئی رنگیں   کہ خوب تر ہے یہ گلگونۂ عروس بلاد
لٹی ہے عزت و ناموس نازنین حرم   چلا ہے گردن طفلاں پہ خنجر جلاد
نہ جان کو ہے اماں اور نہ آبرو محفوظ   زچیرہ دستی و بیدادِ ہندیاں فریاد
ہزار سالہ تمدن کی یادگار لٹی
کہو ظفرؔ سے کہ دلّی کی پھر بہار لٹی

پھر آج دل میں بپا رنج وغم کا طوفاں ہے   پھر آج واصفؔ برگشتہ بخت گریاں ہے
لٹے ہوئے ابھی نوے برس ہی گزرے تھے   پھر آج دلّی میں مسلم کا خون ارزاں ہے
شریک کار جو آزادی وطن میں ہوئے   اب ان پہ تنگ زمین وطن کا داماں ہے
ہوئے ہیں دشمن جاں گھر کے ہی درودیوار   وطن میں آج غریب الوطن مسلماں ہے
یہ کس سے پوچھیں کہ ہم کیا کریں کدھر جائیں   جدھر بھی دیکھو ہر اک عاجز و ہراساں ہے
وبالِ دوش ہے بار حیات اب تو یہاں   کسے خیالِ ہلاکِ متاع و ساماں ہے
یہ جوشِ نفرت و بیگانگی معاذ اللہ   کہ ذرہ ذرہ یہاں آبرو کا خواہاں ہے
پھر اپنے چاہنے والوں سے چھٹ گئی دلّی
صبا! یہ ذوقؔ سے کہنا کہ لٹ گئی دلّی

جلا وطن جو ہوئے ان کا حال کیا ہوگا
دلوں کے زخموں کا اب اندمال کیا ہوگا
ہو بیگناہوں کی لاشوں پہ جس محل کی بنا
مجھے یہ فکر ہے اس کا مآل کیا ہوگا
وطن سے روٹھ گئے تم مگر سنو تو سہی
وطن میں اپنے عزیزوں کا حال کیا ہوگا
دم وداع جو رسم وفا کو بھول گئے
ہمارے قتل کا ان کو ملال کیا ہوگا
کھلی فضاؤں میں گلشن کی کھیلنے والو
تمھیں تو مرغ قفس کا خیال کیا ہوگا
یہ بے نیازئ ساحل یہ وسعتِ طوفاں
اسیرِ موج کا واصفؔ مآل کی اہوگا
اب اجنبی وہ ہوئے جن سے چاہ تھی دل کو
گئے وہ جن سے کبھی رسم و راہ تھی دل کو

نشانِ بہارِ گزشتہ کا پا نہیں سکتے
جو مٹ چکے ہیں وہ اب ہاتھ آ نہیں سکتے
ہمیں تو صفحہ دل سے مٹا دیا تم نے
مگر یہ داغِ فضیحت مٹا نہیں سکتے
سنائیں کیا کہ کلیجہ ہی مونھ کو آتا ہے
کسی کو چیر کے سینہ دکھا نہیں سکتے
سمٹ کے چارطرف سے ہوئے ہیں یوں محصور
کہ باہر اپنے علاقے سے جا نہیں سکتے
یہ حکم ہے کہ نہ ہو امنِ عامہ میں خلل
کسی کو اپنی کہانی سنا نہیں سکتے
گماں ہے ان کو بغاوت کا ہم غریبوں پر
جو معذرت کے لئے لب ہلا نہیں سکتے
حذر کہ دست قضا سست ہو نہیں سکتا
حذر کہ کاتب تقدیر سو نہیں سکتا

ہائے میری دلّی

ہم سفر تھم تو سہی دل کو ٹھہر جانے دے
روح درماندۂ آلام ہے ستانے دے
یہ زمیں کونسی ہے مجھ کو کہاں تو لایا؟
کیوں مجھے عہد گزشتہ کا تصور آیا؟
اے کہ اِقدامِ سفر شام و سحر ہے تجھ کو!
دیکھ کیا ہیں وہ کھنڈر سے یہ خبر ہے تجھ کو؟
دل کھنچا جاتا ہے اس منزل ویراں کی طرف
سر جھکا جاتا ہے اس گرد بیاباں کی طرف
یہ دل زار کی ٹوٹی ہوئی کشتی تو نہیں؟
ہم سفر آہ یہ اجڑی ہوئی دلّی تو نہیں؟
ہاں یہی ہے مری دلّی مری پیاری دلّی
ہاں مری بچھڑی ہوئی راج دلاری دلّی

ہاں اسی کوچے میں میں خاک اڑاتا تھا کبھی
ہاں اسی خاک کو میں سرمہ بناتا تھا کبھی
ہم سفر ہاں انھیں ذروں سے شناسائی تھی
غمِ الفت نے یہیں نشو و نما پائی تھی
میری پیشانی جو سجدے میں گئی تھی پہلے
ہے یہی خاک جو چہرے پہ لگی تھی پہلے
جس کی تاریخ نے غیرت سے شناسائی دی
جس کی مٹی نے رگ و پے کو توانائی دی
آ کہ ایام گزشتہ پہ بہا لیں آنسو
کاش بیتے ہوئے لمحات کو پالیں آنسو
اشکِ عبرت سے تخیل کو ہم اپنے دھولیں
آ کہ اس منبر و محراب سے مل کر رولیں
کاروانِ دل گم گشتہ کی منزل ہے یہی
خونِ صد حسرت و ارمان کا حاصل ہے یہی
یہ ہنر گاہ یہ شاہان وطن کا مسکن
یہ دبستانِ عزیزؒ اور ولیؒ کا گلشن
لٹ گئی آج پھر اس گلشنِ حکمت کی بہار
مل گیا خاک میں تہذیب گزشتہ کا وقار
کس نے آثار قدیمہ کو کیا ہے مسمار؟
کیا یہی ہوتے ہیں اقوام مہذب کے شعار؟
کیا یونہیں ملتا ہے انسان کو دنیا میں عروج
کیا نہتوں پہ یونہیں ہوتا ہے فوجوں کا خروج
رائگاں کیا کہیں قوموں کا لہو ہوتا ہے
یہ تو اک بندۂ صابر کا وضو ہوتا ہے
تابش آموز ہے وہ گوہر غلطاں اب تک
خاک آلودہ ہے پھر بھی ہے درخشاں اب تک
جوئے خوں بہتی ہے پیکان خلیدہ سے ابھی
بوئے تیغ آتی ہے پہلوئے دریدہ سے ابھی
عزم صادق سے ہے معمور دماغ کشتہ
لو نہ دے جائے کہیں دودِ چراغِ کشتہ
زندہ ہیں خیر امم کی وہ روایات ابھی
ثبت ہیں لوح زمانہ پہ وہ آیات ابھی

گو ستم دیدۂ واماندہ تہ دام ہے یہ
ہوشیار اے فلک پیر کہ اسلام ہے یہ

ایک نکتہ چیں اور شاعر

(۱۹۴۹ء)

یوں گلہ مند آج ہے شاعر سے ذہن نکتہ چیں
اب غزل میں تیری وہ رنگ تغزل کیوں نہیں
کیوں گل و بلبل کے افسانوں سے نفرت ہے تجھے
کیوں وصال و ہجر کے قصوں سے وحشت ہے تجھے
عشق و مستی موسم گل جوش مل ابر بہار
یہ جوانی اور یہ بے کیفیٔ لیل و نہار
شعر میں تیرے خمار ساغر و مینا نہیں
نغمہ و رقص و سرود و نشہ و صہبا نہیں

آج وہ شوق و تمنا کی کہانی کیا ہوئی
شوخی مضمون و تخلیق معانی کیا ہوئی
شاعر شیریں نوا اب کیوں ہے اتنا تلخ کام
آج کیوں بدلا ہوا ہے تیرا انداز کلام
بات میں تیری تاثر ہے سیاسیات کا
شعر تیرا آئینہ ہے صورت حالات کا
تیرے چہرے سے نمایاں منظر اندوہ و یاس
محفل عیش و مسرت میں بھی رہتا ہے اداس
کیا تجھے معلوم ہے؟ تیرا وطن آزاد ہے
کیوں ترا احساس پنہاں آج بھی ناشاد ہے
سنکے شاعر نے کہا اے میرے ناداں نکتہ چیں
کیا کہوں اب شعر میں میرے تغزل کیوں نہیں؟
فکر تیرا ہے رہین نقشہ ہائے آب و گل
ترجمان راز ہست و بود ہے شاعر کا دل
ملک بھی آزاد ہے اور قوم بھی مسرور ہے
ہاں مگر انساں ابھی انسانیت سے دور ہے
سانس اگر دنیا میں اطمینان کا لیتا ہے تو
آہ! دھوکا خود ہی اپنے نفس کو دیتا ہے تو
پوچھ آزادی کی لذت بیکس و نادار سے
دھوپ شرماتی ہے جس کی زردیٔ رخسار سے
آج خود انسان سے انسانیت رنجور ہے
آہ! یہ فرزند آدم کس قدر مغرور ہے
بھوک اور غم کے گراتا ہے غریبوں پر پہاڑ
لہلہاتے سبزہ زاروں کو یہ کرتا ہے اجاڑ
نیکی و اخلاق سے یکسر تہی داماں ہے یہ
چند روزہ دولت و اقبال پر شاداں ہے یہ
آج بھی انسانیت شیطان کی محکوم ہے
روح کی عظمت سے اب بھی آدمی محروم ہے
جرم کرنے کے لئے ویدوں کی لیتا ہے پناہ
نام پر قرآن کے کرتا ہے تکمیل گناہ
حشر برپا کر رہا ہے ایٹمک ذرات سے
کام کیا لیتا ہے یہ قدرت کے انعامات سے
خواہشات نفس کا یہ سفلہ اب بھی ہے غلام
خوب سمجھا تو نے آزادی کا مفہوم و مقام
آج اس انسان کی عالم میں کیا کیا دھوم ہے
مادر گیتی کا دل اف کس قدر مظلوم ہے
کیوں ہوا تو میرے انداز سخن پر حرف گیر
کیا کہیں اے دوست! مجرم تو نہیں تیرا ضمیر؟
میں جو رکھتا ہوں رگ انسانیت پر نیشتر
کیوں تڑپ جاتا ہے تو محسن کش شوریدہ سر
گفتگو سے میری بوئے طنز آتی ہے تجھے
بات میری چور سا گویا بناتی ہے تجھے
بیقراری سے مری مجرم بنا جاتا ہے کیوں
دل ہی دل میں میری باتوں سے گھٹا جاتا ہے کیوں
آہ! ناداں تو نے شاعر کو ابھی سمجھا نہیں
تو نے اس کے جوہر تخلیق کو پرکھا نہیں
یہ دل آگاہ و دانا ہے امانت قوم کی
جذبہ حق کو چھپانا ہے خیانت قوم کی

مسلم و ہندو سے بالاتر ہے شاعر کی نظر
دیکھ کر دنیا کو دکھ جاتا ہے شاعر کا جگر
کانپ جاتا ہے کسی کی ناگہاں فریاد سے
سیکھ راز درد مندی شاعر ناشاد سے
اپنے گرد و پیش سے دل کو بچا سکتا نہیں
اپنے احساسات کو شاعر چھپا سکتا نہیں
گو خلافِ طبعِ نازک تلخیٔ گفتار ہے
چپ رہے شاعر تو ملک و قوم کا غدار ہے
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ لے آتا ہوں میں
ہاں وطن کی شرط خدمت یوں بجا لاتا ہوں میں
آسناؤں تجھ کو قول شاعر یکتائے قوم
آہ! وہ اقبال جو تھا دیدۂ بینائے قوم
’’ قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اجزائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعر رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد ہو کوئی عضو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ‘‘
واصفؔ برگشتہ قسمت کو نہ چھیڑ اے ہم نشیں
اس کے نغموں سے نہ تو مغموم ہو جائے کہیں
نفس کی طغیانیوں سے دل بہت مجبور ہے
یہ کلیم مضطرب محتاج برق طور ہے

علامہ اقبالؔ مرحوم

اے کہ تری نگاہ تھی رمز شناس کائنات
اے کہ تری زباں تھی شارح معنیٔ حیات
تیرا دل ادا شناس رہبر جادۂ یقین
واقف سر لا اِلٰہ عارف نکتۂ ثبات
تو نے وطن کو وہ دیا ساغر جذبۂ خودی
آج بھی ذرہ ذرہ ہے جرعہ کش مے حیات
تیرے ہر ایک لفظ میں حکمت و معرفت کی شان
تیری ہر ایک بات میں لذتِ پارۂ نبات
کھول دی تو نے صاف صاف جادوگروں کی ساحری
یاد دلائے قوم کو سعی و عمل کے معجزات
تیرا مقام آگہی دام فریب سے بلند
کھائی ترے کلام سے نطق فرنگ نے بھی مات
تیری قلندرانہ زیست تیری وہ عارفانہ موت
زندہ رہے گا تیرا نام تا بقیام شش جہات

گاندھی جی

(مورخہ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء روز جمعہ شام کے پانچ بجے ناتھورام گوڈسے نے گاندھی جی کو ہلاک کیا)

تیرہ خاک ہند میں اک شمع نورانی تو دیکھ   آسماں اوجِ مقام نوع انسانی تو دیکھ
تذکرہ ماضی کا تو نے ہم نشیں چھیڑا تو ہے   اب ذرا واصفؔ کے دل کی حشر سامانی تو دیکھ
ناخدا کو اپنے خود ہی غرق دریا کر دیا   آہ! اس مخلوقِ دانشور کی نادانی تو دیکھ
اس جہاں میں کیا ملا کرتا ہے نیکی کا صلہ   اس زمیں پر خون انسانی کی ارزانی تو دیکھ
فرقہ بندی قتل و غارت رہزنی محسن کشی   یہ سیہ کرتوت اور عزم جہاں بانی تو دیکھ
اے کہ تیرے دم سے تھی جمعیت اجزائے قوم   روٹھنے والے ہماری خانہ ویرانی تو دیکھ
قوم کا سرمایہ تو اور تیری دولت قوم تھی   جانے والے قوم کی بے برگ و سامانی تو دیکھ

بن ترے ویراں نظر آتی ہے مجھ کو خاک ہند
مرنے والے مدتوں روئے گی تجھ کو خاک ہند

اس گنہ کی اب تلافی کوئی کر سکتا نہیں   یہ دل انسانیت کا زخم بھر سکتا نہیں
کس قدر صبر آزما ہے قتل ہو جانا ترا   اب دل مضطر کسی پہلو ٹھہر سکتا نہیں
جان تک قربان کر دی تو نے ہم پر بے دریغ   عمر بھر محسن ترا احساں اتر سکتا نہیں
عام تھی تیری محبت نوع انساں کے لئے   تیری عظمت کو زمانہ محو کر سکتا نہیں
تو نے مر کر امن و آزادی کو زندہ کر دیا   تیرا پیرو شوکت طوفاں سے ڈر سکتا نہیں
سر بسر جس کی ہو موت و زیست اوروں کیلئے   یاد رکھ قاتل کہ وہ مر کر بھی مر سکتا نہیں
اس کیاری کو ملا ہے خون اک درویش کا   گلشن الفت کا شیرازہ بکھر سکتا نہیں

چھپ گیا سورج مگر دنیا کو روشن کر گیا
چاند کو اپنی شعاعوں سے مزین کر گیا

(چاند: مراد پنڈت جواہر لال نہرو)

◆◆◆

ماخذ و کتابیات

۱)	ماہنامہ برہان دہلی	ندوۃ المصنفین دہلی		متعدد شمارے
۲)	ماہنامہ کتاب نما دہلی	مکتبہ جامعہ دہلی		متعدد شمارے
۳)	ماہنامہ بینات کراچی			مارچ ۱۹۹۰ء
۴)	اردو مصدر نامہ	مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی		مطبوعہ ۱۹۷۵ء
۵)	ادبی بھول بھلیاں	مولانا واصف دہلوی		مطبوعہ ۱۹۷۹ء
۶)	تذکرہ سائل	مولانا واصف دہلوی		مطبوعہ ۱۹۷۵ء
۷)	کفایت المفتی جلد اول	مولانا واصف دہلوی		مطبوعہ ۱۹۷۲ء
۸)	مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ	مولانا واصف دہلوی		طبع چہارم ۱۹۶۹ء
۹)	یہ تھی دلّی	طالب دہلوی	مطبوعہ ۱۹۷۵ء	انجمن ترقی اردو دلّی
۱۰)	میرے زمانے کی دلّی (۱)	ملا واحدی	مطبوعہ ۱۹۵۶ء	نظام المشائخ۔ کراچی
۱۱)	دلّی والے	ڈاکٹر صلاح الدین اردو اکادمی دہلی		
۱۲)	یہ ٹوٹے ہوئے تارے	مولانا شاہ محمد عثمانی		
۱۳)	چراغ سخن	مرزا یاس لکھنوی		
۱۴)	ماہنامہ الفرقان لکھنؤ	مولانا منظور نعمانیؒ		اپریل ۱۹۸۷ء
۱۵)	ماہنامہ دار العلوم	دار العلوم دیو بند		اپریل ۱۹۸۷ء
۱۶)	ماہنامہ ذکر فکر دہلی	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی		اپریل ۱۹۸۷ء
۱۷)	مفتی اعظم ہند	ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری		خدا بخش لائبریری پٹنہ
۱۸)	روزنامہ مشرقی آواز دہلی	ناز انصاری		متعدد شمارے
۱۹)	قومی آواز دہلی ہفت روزہ			
۲۰)	زر گل	مولانا واصف دہلوی		مطبوعہ ۱۹۷۶ء
۲۱)	درس الاسلام	مولانا واصف دہلوی		مطبوعہ ۱۹۶۲ء

◆◆◆

اردو اکادمی دہلی

کے چند اہم مونوگراف

شیخ ظہور الدین حاتم
مرتب: پرفیسر عبدالحق
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۰

میر ناصر علی دہلوی
مرتب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۸

شاہ نجم الدین مبارک آبرو
مرتب: پروفیسر خالد محمود
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۸

خواجہ الطاف حسین حالی
مرتب: ڈاکٹر شہزاد انجم
قیمت: ۴۰ روپے صفحات: ۱۵۶

مومن خاں مومن
مرتب: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۰

قائم چاندپوری
مرتب: ڈاکٹر خالد علوی
قیمت: ۱۰۰ روپے صفحات: ۲۶۴

مرزا محمد رفیع سودا
مرتب: ڈاکٹر مظہر احمد
قیمت: ۵۰ روپے صفحات: ۱۸۴

میر اثر
مرتب: ڈاکٹر مولا بخش
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۱۲

مرزا غالب (شاعری)
مرتب: پروفیسر ابوالکلام قاسمی
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۸

میر امّن
مرتب: پروفیسر ابن کنول
قیمت: ۴۰ روپے صفحات: ۱۵۲

مرزا غالب (مکتوب نگاری)
مرتب: ڈاکٹر خالد اشرف
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۸

فائز دہلوی
مرتب: ڈاکٹر کوثر مظہری
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۸

میر تقی میرؔ
مرتب: پروفیسر مظفر حنفی
قیمت: ۵۰ روپے صفحات: ۱۸۴

سرسیّد احمد خاں
مرتب: پروفیسر افتخار عالم خاں
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۰

خواجہ میر درد
مرتب: پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۱۲۸

رابطہ: سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی Ph : 23863858, Fax : 23863773

قیمت: ۵۰ روپے